امام علیِ رضا علیہ السلام

مولفۂ

بنت زہرا نقوی ندیٰ الہندی

ناشر

نور ہدایت فاؤنڈیشن

حسینیہ غفران مآبؒ، مولانا کلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ-۲۲۶۰۰۳ (ہندوستان)

امام علی رضا علیہ السلام

بنت زہرا نقوی ندیٰ الہندی

Imam Ali-e-Reza (A.S.)

By

Binte Zahra Naqavi Nadal Hindi

Publisher

Noor-e-Hidayat Foundation

Imambara Ghufranmaab, Maulana Kalbe Husain Road, Chowk, Lucknow-226003 (INDIA)

Website : www.noorehidayatfoundation.org

امام علیِ رضا علیہ السلام

مولفۂ

بنت زہرا نقوی ندیٰ الہندی

ناشر

نورھدایت فاؤنڈیشن

امامباڑہ غفران مآبؒ، مولانا کلب حسین روڈ، چوک، لکھنؤ-۳/انڈیا

نام کتاب	:	**امام علیِ رضا علیہ السلام**
مصنفہ	:	بنت زہرا نقوی ندیٰ الہندی
ناشر	:	نورِ ہدایت فاؤنڈیشن، لکھنؤ
کمپوزنگ	:	جائسی کمپیوٹر پوائنٹ (08736009814)
سنہ اشاعت	:	یکم دسمبر ۲۰۱۶ء
تعداد	:	پانچ سو
ہدیہ	:	۱۰۰/روپے

ملنے کا پتا

۱۔ نورِ ہدایت فاؤنڈیشن امام باڑہ غفران مآبؒ، چوک، لکھنؤ-۳ (یو۔پی۔)

فون: 0522-2252230 موبائل: 9335996808 — 8736009814

فہرست

۱۔عرض نور۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۴

۲۔امام رضاؑ اور سیاسی جدو جہد۔۔۔۔۔۔رہبرِ معظم آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای۔۔۔۔۵

۳۔آٹھویں امام حضرت علی رضاؑ۔۔۔۔آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی۔۔۔۔۲۰

۴۔امام علی رضا علیہ السلام۔۔۔۔۔۔پروفیسر محسن مظفر نقوی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۳۲

۵۔امام علی رضاؑ کو ولی عہدی کی پیشکش۔۔۔۔۔۔پروفیسر محسن مظفر نقوی۔۔۔۔۔۔۴۳

۶۔امام رضاؑ اور ان کا طریقۂ کار۔۔۔۔بنتِ زہرا نقوی ندیٰ الہندی۔۔۔۔۔۔۔۴۹

۷۔منقبتِ امام علی ابنِ موسیٰ الرضاؑ۔۔۔حضرت شیخ الاسلام ژندہ پیلؒ۔۔۔۔۔۔۔۶۲

۸۔منقبتِ امام علی ابنِ موسیٰ الرضاؑ۔۔۔۔حضرت ملّا عبدالرحمٰن جامیؔ۔۔۔۔۔۔۶۴

۹۔منقبتِ شاہِ خراسان۔۔۔۔مولانا شاہ محمد ابوالحسن، فردؔ، پھلواری شریف۔۔۔۔۔۶۵

۱۰۔مشہد رضاؑ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اشتیاق حسین رضوی ساحرؔ فیض آبادی۔۔۔۔۔۔۶۷

۱۱۔مرثیہ: درحالِ امامِ رضا علیہ السلام۔۔۔۔مولانا سید محمد جعفر اُمیدؔ اجتہادی۔۔۔۶۸

عرض نور

ہمارے ائمہ معصومینؑ مکارم اخلاق و کردار کی معراج پر فائز ہیں۔ ان کی سیرت طیبہ وحدت گفتار و کردار کا زندہ و پائندہ معجزہ ہے۔ یہ شریک نور 'لولاک' ہستیاں ہمارے لئے واجب التاسی اسوہ اور فیضان و ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔ اسی لئے مشیت ایزدی یہی ہوگی کہ ان کی فیض رسانی کا باب ہر کس و ناکس کے لئے ہمیشہ وا رہے۔ لیکن دنیا خصوصاً عالم حکومت و سیاست کی حتی المقدور کوشش رہی کہ ان پاک کردار معصوم ہستیوں کو دنیا سے دور رکھا جائے اسی سے یہ سراسر فیض پیکر ہدایت شخصیتیں ہمیشہ متشدد جہری و سری ظلم و ستم کے نشانہ پر رہیں۔ یہاں تک ان کی گیارہ ہستیاں شہادت سے ہم کنار ہوتی گئیں تو پھر ان کی آخری کڑی کو بقیۃ اللہ کے طور پر مشیت ایزدی نے پردہ غیبت میں محفوظ و زندہ و قائم رکھا۔ تقریباً ڈھائی صدیوں پر محیط ان عصمت پناہ عظمت مآب ہستیوں کی 'ظاہری حیات' کے صرف چند سال ہی وہ ہیں جب انہیں عام منظر نامہ پر آنے اور عام ڈھرے کی تاریخ کی نظروں میں سمانے کا موقع میسر ہوا۔ یہ وہ برس ہیں جو مولائے کائنات امیر المومنینؑ کی ظاہری حکومت اور امام رضاؑ کی ولیعہدی کے زمانہ تک محدود ہیں۔ ان میں امام ثامن و ضامن کی ولیعہدی کچھ زیادہ ہی آزمائشی تھی۔ لیکن اسے جس طرح آپ نے برتا وہ دنیا کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا۔ اسی لئے ولیعہدی کے قبول کرنے پر اصرار زبردستی اور جان کی دھمکی تک بڑھا۔ امام، صاحب اقتدار سے عمر میں بھی بڑے تھے، ان کو ولیعہد بنایا جانا چہ معنی دارد؟ ولیعہدی دراصل اس بیعت کا بدلا ہوا نام تھا جس کا جنازہ امام رضاؑ کے جد سید الشہداءؑ نے کربلا میں ہی نکال دیا تھا کہ بیعت کی حیثیت ایوان حکومت میں ڈراونے خواب سے زیادہ نہ رہ گئی تھی۔ امام کی طرف سے ولیعہدی کو مشروط طور پر قبول کرنا سیاست کی منشا پر منہ توڑ طمانچہ تھا۔ ان صفحات میں امامؑ کی اس اقدام کے پیچھے کی حکمت پر کچھ بھی تفصیل سے بات نہیں کی جا سکتی۔

سردست موسسہ نور ہدایت کی یہ اشاعت انہیں امامؑ عالیمقام سے معنون اور انہیں کی حیات طیبہ کے ذکر کی نذر ہے۔ اس میں مشاہیر اہل قلم کی قابل قدر پر، مغز نگارشات کے ساتھ امامؑ کے حال پر ایک مرثیہ بھی شامل ہے۔ اُمید ہے ہمارے اہل نظر قارئین کا ذوق سلیم اسے منظور و مقبول کرے گا۔

مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی

مسؤل نور ہدایت فاؤنڈیشن، لکھنؤ

امام علی رضا علیہ السلام اور سیاسی جدوجہد

آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

ترجمہ: مولانا سید ولی الحسن رضوی

امام رضا علیہ السلام کا دور

جب بات امام رضا علیہ السلام تک پہونچتی ہے حالات دوبارہ بہتر ہوجاتے ہیں۔ امامؑ کو نسبتاً سکون کے ساتھ تبلیغ و اشاعت کا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ ہر طرف شیعہ پھیلتے نظر آتے ہیں، امکانات میں بھی اتنی فراوانی پیدا ہوجاتی ہے کہ مسئلہ امامؑ کی ولی عہدی پر جاکر منتہی ہوتا ہے اگرچہ جب تک ہارون بقید حیات رہا امام ہشتمؑ کو بھی خاموشی اور تقیہ کی زندگی بسر کرنی پڑی پھر بھی آپ کی جدوجہد اور سیاسی مہم جاری رہتی ہے، اسلامی تحریک اور تبلیغ و ابلاغ میں خلل پیدا نہیں ہوسکا گو کہ یہ سارے کام مکمل احتیاط کے ساتھ خفیہ طور پر انجام پاتے ہیں ــــ انسان سمجھ سکتا ہے مثال کے طور پر دعبل خزاعی کا حضرتؑ کی ولی عہدی کے دوران ان الفاظ میں مدح سرائی کرنا ظاہر ہے یہ چیز یکا یک زمین سے نہیں برآمد ہوگئی تھی ــــــ وہ معاشرہ جس میں دعبل خزاعی جیسی شخصیت پرورش پارہی ہو اور ابراہیم ابن عباس جو حضرت کے مداحوں میں سے ہیں یا اسی قسم کے دوسرے کئی افراد جہاں موجود ہوں اس کی ثقافت و معاشرت میں خاندان رسول کے ساتھ محبت و ارادت کا عنصر موجود ہونا ایک بدیہی سی بات ہے ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی بنیاد کے دفعتاً مدینہ، خراسان، رَے نیز دیگر دور دراز علاقوں میں لوگ امام رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کا جشن منانے لگتے ہیں سوائے اس کے کہ یہ مان لیا جائے کہ پہلے سے اس طرح کے نقوش مرتب ہورہے تھے۔ وہ حالات و واقعات جو امام علیہ السلام کی ولی عہدی کے دوران پیش آتے ہیں (بڑی اہمیت کے حامل ہیں) ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت کی ولی عہدی کے دوران عوام کے جوش و جذبات، اہلبیتؑ کی محبت و عقیدت کے سلسلہ

میں بڑی اونچی سطح پر پہونچ چکے تھے۔ بہرحال بعد میں امین اور مامون کے درمیان شدید اختلاف کی وجہ سے بغداد و خراسان کے درمیان پانچ سال تک جنگ و جدال کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور یہ چیز امام رضا علیہ السلام کے لیئے اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے اور یہ سلسلہ ولی عہدی کے ساتھ اپنی انتہا کو پہونچ جاتا ہے افسوس بس اس بات کا ہے کہ یہاں بھی امامؑ کی شہادت کی وجہ سے رشتۂ رشد و ہدایت قطع ہوجاتا ہے اور ایک بار پھر ایک نئے دور سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو اہلبیتؑ کے لیئے جانفشانی اور غم و آلام کا دور کہا جاسکتا ہے۔ میری نظر میں امام جواد علیہ السلام اور آپ کے بعد کا دور اہلبیت علیہم السلام کے لیئے ہمیشہ سے زیادہ بدتر دور رہا ہے اور اس میں ان حضرات کو سب سے زیادہ محنت و جانفشانی کرنی پڑتی ہے۔ یہ ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی کا مجموعی خاکہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے عرض کردیا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کردیا تھا کہ میں اپنی بحث کو دو حصوں میں منقسم کررہا ہوں جس کا ایک حصہ یہی مجموعی سیاسی خاکہ تھا جو اس منزل پر تمام ہوجاتا ہے۔ اب رہی دوسرے حصہ کی بات جو ائمہ علیہم السلام کی اس سیاسی جدوجہد کے نمود و اثرات سے متعلق ہے۔ اس وقت شاید اس سلسلہ میں تفصیلی بحث نہ ہوسکے لیکن وہ چیز جو میں نے محسوس کی ہے اور ادھر وقت نکال کر دو ایک روز اس پر کام کرسکا ہوں محض عنوان کے طور پر یہاں ذکر کردینا چاہتا ہوں۔ البتہ یہ ذہن میں رہے کہ تمام قابل بحث عنوانات میں نہیں پیش کررہا ہوں بلکہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیئے نمونہ کے طور پر صرف چند عنوانات حاضر خدمت ہیں۔

ائمہ کی سیاسی جدوجہد کے نمود و آثار

ان میں سے ایک مسئلہ ''امامت کا ادعا اور اس کی طرف دعوت'' ہے جو ائمہ کی زندگی میں جگہ جگہ نظر آتا ہے اور ان حضرات کی سیاسی جدوجہد کا یہی بنیادی محور ہے۔ دراصل یہ ایک مبسوط فصل ہے جس کے ذیل میں مختلف ابواب کے تحت روایات موجود ہیں منجملہ اس کے کافی کی روایت: ''الائمۃ نور اللّٰہ ... '' امامت کی معرفی کے ذیل میں امام ہشتمؑ کی روایت نیز صادق اہلبیت

طہارتؑ سے مروی مختلف روایات اور طرح طرح کے مخالفین سے آپ کے اصحاب کے مجادلے، اس کے علاوہ اہل عراق کو دعوت دیتے ہوئے امام حسینؑ کی زندگی سے متعلق روایات غرضیکہ اس موضوع پر بہت سی روایتیں موجود ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ائمہ کی کوششوں اور دعوؤں سے خلفائے وقت کیا سمجھتے تھے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ سے لے کر متوکل عباسی کے دور تک مسلسل طور پر ائمہ کے مقاصد اور منصوبوں کے سلسلہ میں ایک ہی فکر وخیال پایا جاتا ہے۔

ہمیشہ خلفاء اور ان کے عمال وکارندے ائمہ علیہم السلام کو ایک ہی نظر سے دیکھتے رہے اور قہری طور پر ائمہ کے بارہ میں ان کی طرف سے ایک ہی انداز کا فیصلہ صادر ہوتا رہا ہے۔ یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اور بآسانی اس سے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ ائمہ کے سلسلہ میں ان سب کا ایک ہی نظریہ کیوں ہے؟ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ مثال کے طور پر امام ہفتم موسیٰ ابن جعفرؑ کے سلسلہ میں یہ کہا جانا کہ ''خلیفتان یجبی الیھما الخراج۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' یا امام ہشتم علی رضا علیہ السلام کے لیئے یہ جملہ: ''ھٰذا علی ابنہ قد قعد و ادعی الامر لنفسہ۔۔۔۔۔۔۔'' یا دیگر ائمہؑ کے بارہ میں اسی قسم کے جملے اس بات کی واضح نشان دہی کرتے ہیں کہ خلفائے وقت اور ان کے رفقائے کار ائمہ کی زندگی سے کس قسم کے دعووں کا استنباط کرتے تھے۔ یہ نہایت ہی قابل توجہ اور اہم ترین نکتہ ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ خلفائے وقت کا اپنی امامت پر اصرار اور شیعیان آل محمدؐ کا اس امر کی نزاکت کے پیش نظر مسلسل اس کی مخالفت کرنا ہے۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ جس کی اور بھی نظیریں موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: کثیرؔ جو دور بنوامیہ کے پہلے دور کے صف اول کے شعراء (یعنی فرزدقؔ، حریرؔ، اخطل، جمیلؔ اور نصیبؔ وغیرہ کا ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے) شیعہ اور امام محمد باقر علیہ السلام کے عقیدتمندوں میں سے ہے ایک دن امام پنجم کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے، امام علیہ السلام شکایت کے لہجہ میں اس سے سوال کرتے ہیں: امتدحت عبد الملک؟ میں نے سنا ہے کہ تم نے عبد الملک کی مدح سرائی کی ہے؟! وہ ایک دم گھبرا کر امام سے عرض کرتا ہے: یابن رسول اللہ ماقلت لہ

''یا امام الھدیٰ'' اے فرزند رسولؐ میں نے اس کو امام ہدیٰ تو نہیں کہا ہے ''وانما قلت لہ اسد والاسد کلب و یا شمس والشمس جماد و یا بحر والبحر موات۔۔۔۔۔'' ہاں میں نے اس کو شیر، سورج، سمندر، پہاڑ اور اژدہا جیسے خطابات سے ضرور نوازا ہے اور کسی کے لیئے درندہ ہونا یا جماد سے قرار دیا جانا وغیرہ کوئی فضیلت کی بات تو نہیں ہے۔ اس طرح امامؑ کے سامنے کثیرؔ اپنے عمل کی توجیہ پیش کرتا ہے کہ امام کے لبوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور تب شاعر آل محمد کمیتؔ اسدی اٹھتا ہے اور اپنا وہ ''قصیدہ ہاشمیہ'' سناتا ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

من لقلب میتم مستھام غیر ماصبوۃ و لا احلام

یہاں تک کہ وہ اس شعر پر پہنچتا ہے:

ساسۃ لا لکمن یریٰ رعیۃ الناس

سواء و رعیۃ الانعام

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام عبدالملک جیسے کی مدح کے سلسلہ میں کتنے حساس تھے اور دوسری طرف کثیر کے مثل آپ کے دوستوں کی حساسیت ''امام الھدیٰ'' پر مرکوز تھی تو وہ فوراً کہتا ہے کہ مولا! میں نے عبدالملک کو امام الھدیٰ نہیں کہا ہے —— اور یہی واقعہ اس بات کی بھی صاف نشان دہی کرتا ہے کہ خلفائے وقت کو اپنے امام الھدیٰ کہے جانے کی کتنی تمنا تھی۔ چنانچہ بنوعباس کے یہاں یہ جذبہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کرلیتا ہے —— مروان ابن ابی حفصہ اموی جسکو بنوامیہ اور بنوعباس دونوں درباروں کی غلامی اور مداحی کا فخر حاصل ہے (جی ہاں! یہی تو عجیب چیز ہے یہ شخص بنوامیہ کے زمانہ میں درباری شاعر تھا اور جب بنوعباس برسر اقتدار آئے تو ان کا بھی درباری شاعر بن گیا!! چونکہ اس کو زبان وبیان پر بڑی قدرت حاصل تھی لہٰذا بنوعباس نے بھی اس کو پیسوں کے ذریعہ خرید لیا) چنانچہ جب یہ بنوعباس کی مدح سرائی پر کمر باندھتا ہے تو یہ ان کی شجاعت و کرم جیسی عامیانہ مدح پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ان کی پیغمبر اسلام کے ساتھ قرابت داری کی بنیاد پر انہیں اس مقام ومرتبہ تک پہونچا دیتا ہے جس کے وہ دیرینہ متمنی تھے۔ اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:-

انی یکون ولیس ذاک بکائن

لبنی البنات وراثۃ الاعمام

یعنی یہ چیز کیسے ممکن ہے کہ دختر زادے چچا کی میراث کے حقدار بن جائیں؟ کیا کہنا! پیغمبر کے چچا عباس کی میراث نہیں معلوم یہ دختر زادے (اولاد فاطمہؑ) کیوں ہڑپ کر لینا چاہتے ہیں!!

آپ نے ملاحظہ فرمایا یہ سارا جھگڑا حق خلافت کے مسئلہ پر ہے اور حقیقتاً یہی سیاسی و ثقافتی جنگ رہی ہے۔ چنانچہ اس کے جواب میں مشہور و معروف شیعہ طائی شاعر، جعفر بن عفان کہتا ہے:-

لم لا یکون ؟ و ان ذاک لکائن

لبنی البنات وراثۃ الاعمام

للبنت نصف کامل من ماله

والعم متروک بغیر سهام

یعنی بیٹی اپنے باپ کے نصف مال کی وارث ہوتی ہے اور بیٹی کی موجودگی میں چچا کا مرنے کے والے کے ترکہ میں کچھ بھی حق نہیں ہوتا لہٰذا میراث میں تمہارا حق ہی کیا ہے جو طلب کر رہے ہو۔

اس واقعہ سے بھی امامت کے مسئلہ میں شیعیان آل محمدؐ کی حساسیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ ائمہ علیہم السلام کی طرف سے خونین جدوجہد کی تائید و حمایت ہے جس کا شمار ائمہ کی زندگی سے متعلق گرما گرم بحثوں میں ہوتا ہے اور ائمہ کی سیاسی جدوجہد کی پالیسی کی حکایت کرتا ہے۔ مثلاً معلیٰ بن خنیس جس وقت داؤد بن علی کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں اس وقت کے امام جعفر صادقؑ کے تاثرات و اظہارات ملاحظہ فرمائیں یا اسی طرح جناب زید شہید، سید الشہداء امام حسین علیہ السلام، شہید فخ نیز بعض دوسرے حضرات کے سلسلہ میں امام علیہ السلام کے

ارشادات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے ''نور الثقلین'' میں ایک عجیب و غریب روایت دیکھی، یہ روایت علی ابن عقبہ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:-

''ان ابی قال دخلت انا والمعلی علی ابی عبدالله (ع) فقال (ع): ابشروا انتم علی احدی الحسنیین شفی الله صدورکم و اذهب غیظ قلوبکم وانالکم من عدوکم وهو قول الله تعالیٰ و یشف صدور قوم مومنین و ان مضیتم قبل ان یروا ذلک مضیتم علیٰ دین الله الذی رضیه لنبیه (ص) ولعلی (ع)''

میں اور معلیٰ ابوعبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرتؑ نے فرمایا: تم لوگوں کو بشارت ہو کہ دو میں سے ایک نیک ترین انجام (کامیابی یا شہادت) تمہارا منتظر ہے خداوند عالم نے تمہارے سینوں کو شفا عطا کیا (یا کرے) اور تمہارے دلوں کے غیظ و غضب کو ٹھنڈے کر دئے (یا کرے) اور تم کو دشمنوں پر مسلط کر دیا (یا کرے) اور یہی وعدۂ الٰہی ہے جو خدا نے (مومنین سے) کیا ہے ''ویشف صدور قوم مومنین'' قبل اس کے کہ یہ کامیابی تمہارے قدم چومے اگر تم دنیا سے رخصت ہو جاتے (یا رخصت ہو جاؤ) تو تمہاری قربانی خدا کے اس دین کے لیئے ہے (یا ہوگی) جس کو پروردگار نے اپنی نبی (محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور علی (علیہ السلام) کے لیئے پسند فرمایا ہے۔

یہ روایت اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں جہاد و مبارزہ، کامیابی و کامرانی اور قتل کرنے اور قتل کر دئے جانے کے سلسلہ میں بات کی گئی ہے۔ بالخصوص اس میں معلیٰ بن خنیس مخاطب ہیں جن کے واقعہ سے ہم سب واقف ہیں۔ امام علیہ السلام بغیر کسی تمہید و مقدمہ کے بات شروع کر دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ امامؑ کسی خاص چیز یا حادثہ سے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جبکہ کسی کو

حادثہ کا علم نہیں ہے۔ ممکن ہے ''شفی اللہ صدورکم'' تا آخر کی عبارت امام علیہ السلام نے دعا کے طور پر ارشاد فرمائی ہو اور زیادہ احتمال اس بات کا ہے کہ امام کسی پیش آئے ہوئے واقعہ کی خبر دے رہے ہوں تو آیا یہ دونوں حضرات کسی مہم سے واپس ہوئے تھے جس کی حضرت کو خبر تھی یا ہوسکتا ہے کہ خود امامؑ نے ان کو اس مہم پر مامور کیا ہو؟

کچھ بھی ہو حدیث کا لب ولہجہ ان میں سے ہر دو معنی واحتمال کی بنیاد پر واضح طور پر بتاتا ہے کہ امام علیہ السلام اس تیز وتند اور مخاصمت آمیز طریقہ کار کے حامی تھے جو معلیٰ بن خنیس کی روزمرہ کی زندگی میں دیکھنے میں آتا ہے اور یہ چیز بھی توجہ کے قابل ہے کہ معلیٰ امام صادقؑ کے ''باب'' ہیں اور یہ ''باب'' کی تعبیر خود اپنی جگہ پر ایک مستقل فکر وتحقیق کا موضوع ہے۔

وہ حضرات جو روایات میں ائمہ علیہم السلام کے ''باب'' کے طور پر پیش کئے گئے کون لوگ ہیں؟ جبکہ ان میں سے زیادہ تعداد ان کی ہے جو یا تو مقتول ہیں یا جن کو قتل کی دھمکی دی گئی ہے؟ مثال کے طور پر یحییٰ بن ام الطویل، معلیٰ بن خنیس، جابر بن یزید جعفی ۔۔۔۔ وغیرہ

ائمہ علیہم السلام کی زندگی سے متعلق ایک اور بحث ان کا قید خانوں میں رکھا جانا، گھر سے دربدر کیا جانا اور انھیں زیر نظر رکھا جانا بھی ہے اور میری نظر میں یہ موضوع بہت زیادہ تحقیق وتدقیق کا طالب ہے کیونکہ اس سلسلہ میں بہت سے مطالب تحقیق ودقت نظر کے محتاج ہیں اور دامن وقت میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی خاطر خواہ بحث کرسکوں۔

ایک اور مسئلہ خلفا کے مقابلہ میں ائمہ علیہم السلام کا بے خوف وخطر، صاف وصریح بے باک رویہ ہے اور اس بحث کے ذیل میں قابل غور وفکر نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ حضرات بھی معاذ اللہ دبو، مفاہمت پسند اور حالات سے سمجھوتہ کرنے والے ہوتے تو اپنے دور کے دوسرے علماء وزہاد کی طرح کسی مخالفانہ لب ولہجہ کے بجائے نرم وشیریں انداز کلام کا انتخاب کرتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت بہت سے ایسے علماء وزہاد موجود تھے جن سے خلفاء نہ صرف علاقہ ومحبت بلکہ ارادت بھی رکھتے تھے۔ ہارونؔ کہتا تھا ؎

کلکم	یمشی	روید
کلکم	یطلب	صید
غیر	عمرو بن	عبید

یہ لوگ خلفاء کو نصیحتیں بھی کرتے ہیں حتی کہ کبھی کبھی ان کو رلاتے بھی ہیں پھر بھی یہ حضرات خلفاء کو ظالم وجابر اور طاغی وغاصب یا شیطان اور اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے ذریعہ یاد کرنے سے احتراز واحتیاط برتتے ہیں اس کے برخلاف ائمہ علیہم السلام ایسی کوئی رعایت نہیں کرتے حقائق کا برملا اظہار فرمادیتے ہیں، ارباب حکومت کے ظاہری جاہ وحشم اور سطوت وہیبت ان کی زبانیں بند نہ کرسکی۔

ایک اور بحث ائمہ علیہم السلام کے ساتھ خلفائے وقت کی معاندانہ روش ہے مثال کے طور پر امام صادقؑ اور منصور کے درمیان نیز امام کاظمؑ اور ہارون کے درمیان جو حادثات وواقعات رونما ہوتے رہے ہیں اور جن میں سے دو ایک نمونے ہم نے اشارہ کے طور پر ذکر بھی کئے ہیں۔

امامت کی حکمت عملی

ایک دوسری بحث جو پورے طور پر قابل توجہ اور لائق مطالعہ ہے، ائمہ علیہم السلام کے بے باک دعوے ہیں جن سے امامت کی بنیادی حکمت عملی کا صاف پتہ چلتا ہے۔ کہیں کہیں ائمہؑ کے ارشادات ومباحثات میں اس طرح کے دعوے اور بیانات نظر آتے ہیں جو عام انداز سے بالکل مختلف ہیں اور ایک خاص مقصد وراہ عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی واقعات سے امامت کی صحیح حکمت عملی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی موارد میں سے ایک وہ موقع ہے جب حضرت موسیٰ ابن جعفر علیہما السلام سے ہارون فدک کے بارے میں گفتگو چھیڑتا ہے۔

ہارون امام علیہ السلام سے کہتا ہے: **حدفدکا حتی اردھا الیک** فدک کے حدود معین کردیجئے تاکہ اسے ہم آپ کو واپس کردیں۔

اس کا خیال تھا کہ اس طرح فدک کا نعرہ جو ہمیشہ تاریخ میں اہلبیت علیہم السلام کی

مظلومیت کے عنوان سے دوہرایا جاتا رہا ہے اس کو بے اثر بنادے اور ذریت رسولؐ سے ان کا یہ ہتھیار چھین لے اور شاید اس طرح شیعوں کے ذہنوں میں اپنے اور غاصبین فدک کے درمیان فرق جتانا بھی مقصود رہا ہو چنانچہ حضرتؑ پہلے تو اس کی پیشکش کو رد کر دیتے ہیں اور جب اس کی طرف سے اصرار بڑھتا ہے تو امام علیہ السلام فرماتے ہیں: ''لا اخذھا الا بحدودھا'' اگر فدک واپس ہی کرنا ہے تو اس کی واقعی حدود کے ساتھ واپس کرو۔ ہارون قبول کر لیتا ہے تو امامؑ حدود فدک معین فرمانا شروع کر دیتے ہیں:۔

''اما الحد الاول فعدن'' اس کی پہلی حد، عدن ہے

یہ گفتگو مدینہ یا بغداد میں ہو رہی ہے ــ امام جزیرۂ عرب کی آخری سرحد عدن کو فدک کی ایک حد کے طور پر معین کر رہے ہیں۔

''فتغیر وجہ الرشید و قال: ایھا'' ہارون رشید کے چہرہ کا رنگ اڑ جاتا ہے اور بے اختیار کہتا ہے۔ اوہ!

حضرت فرماتے ہیں: ''و الحد الثانی سمرقند'' اس کی دوسری حد سمرقند ہے۔ مشرق میں ہارون کی سلطنت یہیں منتہی ہوتی تھی۔

''فاربد وجھہ'' ہارون کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔

امامؑ فرماتے ہیں: ''و الحد الثالث افریقیہ'' اور اس کی تیسری حد ٹیونس سے ملتی ہے۔ یہ عباسی حکومت کی مغربی سرحد ہے۔

''فاسود وجھہ و قال: ھیہ'' ہارون کا چہرہ غصہ سے سیاہ پڑ جاتا ہے اور کہتا ہے: اچھا؟!! امامؑ اپنی بات جاری رکھتے ہیں ''و الحد الرابع سیف البحر مما یلی الجزر و ارمینیہ'' اور اس کی چوتھی سمت سمندر کے کناروں سے ملتی ہے جس کی پشت پر جزیرے اور ارمنستان ہیں۔ یہ ملک کا آخری شمالی حصہ ہے۔

اب ہارون کا پارہ آخری نقطہ پر پہونچ چکا تھا کھسیاہٹ اور غصہ کے عالم میں کہتا ہے:

فلم یبق لنا شئ فتحول الیٰ مجلسی !! پس ہمارے لیئے کیا بچتا ہے اٹھئے اور میری جگہ بیٹھ جایئے۔ قال موسیٰ ''قد اعلمتک انی ان حددتھا لن تردھا'' امامؑ نے فرمایا: میں نے پہلے ہی تجھ سے کہدیا تھا کہ اگر میں نے فدک کی حدیں بیان کر دیں تو کبھی واپس نہ کرے گا۔

حدیث کے آخری الفاظ یہ ہیں: ''فعند ذلک عزم علیٰ قتلہ'' یعنی یہی وہ منزل تھی جب ہارون امامؑ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے۔

اس پوری گفتگو میں واضح ترین چیز امام علیہ السلام کا ادعا ہے وہ چیز جس کو ہارون نے بھی اچھی طرح سمجھ لیا اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے قتل پر کمر بستہ ہو گیا۔ اور اسی قبیل کے اظہارات جس سے ائمہ علیہم السلام کے دعوؤں کا صاف پتہ چلتا ہے امام باقرؑ، امام صادقؑ اور امام رضاؑ کی زندگیوں میں بھی نظر آتے ہیں جن کو اگر یکجا کر دیا جائے تو امامت کا موقف واضح طور پر سامنے آجائے۔

ائمہؑ کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں ان کے اصحاب کا نظریہ

ائمہؑ کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ایک اور مسئلہ جس کی تحقیق اور چھان بین ضروری معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ ائمہؑ کے مقاصد ان کے طریقۂ کار اور مدعا کے سلسلہ میں ائمہؑ کے اصحاب کیا نظریہ رکھتے تھے، اس کا جائزہ لیا جائے۔ بدیہی سی بات ہے کہ ہمارے مقابلہ میں اصحاب ائمہؑ ان بزرگواروں سے زیادہ نزدیک بھی تھے اور ان کے مقصد و مدعا سے زیادہ واقف و آگاہ بھی تھے تو سوال یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے کیا تاثرات تھے اور وہ اس کی کیا تفسیر کرتے تھے؟ کیا روایات سے اس نکتہ کی وضاحت نہیں ہوتی کہ خود اصحاب بھی قیام و خروج کے منتظر تھے؟ خراسان کے اس شخص کی داستان سے کون ناواقف ہے جو امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ کئی لاکھ مسلح افراد وارد میدان ہونے کے سلسلہ میں آپ کے اشارہ کے منتظر ہیں۔ جب حضرت مذکورہ اعداد و شمار پر تعجب فرماتے ہیں تو وہ پے در پے اعداد میں کمی کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ بات کو ختم کرتے ہوئے امامؑ اپنے اصحاب اور انصار کے اوصاف بیان کرنے کے بعد

فرماتے ہیں: اگر اس طرح کے اتنے (۱۲، ۱۵ یا..... افراد اختلاف روایات کے ساتھ) مجھے میسر ہوتے تو میں میدان میں آجاتا۔

اس طرح کے بہت سے افراد امام کے پاس آکر قیام کا تقاضہ کرتے رہے ہیں (روایات میں خروج کا لفظ استعمال ہوا ہے البتہ بعض موارد میں امامؑ سے قیام کا مطالبہ کرنے والوں میں عباسی حکومت کے جاسوس بھی ملتے ہیں جس کا اندازہ امامؑ کی جانب سے ان کو دئے جانے والے جوابات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے)

آخر یہ افراد امامؑ کی خدمت میں اس قسم کا مطالبہ لے کر کیوں حاضر ہورہے تھے؟ کیا اس سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ اس وقت شیعوں کے درمیان حق وانصاف پر مبنی حکومت کی تاسیس کے لیئے قیام وخروج ایک حتمی اور ائمہؑ کے مقاصد سے ہم آہنگ امر شمار ہوتا تھا چنانچہ ائمہ علیہم السلام کے اصحاب وانصار میں یہ بات مشہور تھی کہ امامؑ کسی مناسب موقع کی تلاش میں ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک قابل توجہ روایت نظر سے گذری جس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ زرارہؔ ابن اعین جیسے بلند مرتبہ صحابی بھی اس سلسلہ میں کیا نظریہ رکھتے تھے۔ رجال کشی میں روایت ہے: ایک دن زرارہ امامؑ کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص اپنی تلاش میں سرگرم دشمن کے ہاتھوں سے بھاگ نکلا ہے اگر ''یہ امر'' (حکومت کے لیئے قیام) نزدیک ہو تو وہ صبر کرے تاکہ قیام کرنے والوں کے ساتھ خروج کرے اور اگر اس میں تاخیر ہو تو وہ مصالحت کرلے۔ حضرتؑ فرماتے ہیں: ''وہ وقت آئے گا'' زرارہ سوال کرتے ہیں: کیا ایک سال کے اندر ایسا ہوگا؟ امامؑ فرماتے ہیں: ''انشاء اللہ وہ وقت آئے گا'' زرارہ پھر پوچھتے ہیں: کیا دو سال لگ جائے گا؟ امامؑ اپنا جملہ دہرا دیتے ہیں: ''انشاء اللہ وہ وقت آئے گا'' اور زرارہ یہ سوچ کر خاموش ہوجاتے ہیں کہ دو سال تک آل علیؑ کی حکومت قائم ہوجائے گی۔

یقیناً زرارہ سادہ لوح و بے اطلاع افراد میں سے نہ تھے وہ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے قریب ترین اصحاب میں سے تھے ان کا اس قدر قریب ترین زمانہ میں حکومت علوی کی

تشکیل کا اندازہ لگانا ظاہر ہے بلا وجہ نہیں ہوسکتا۔

ایک دوسری روایت میں ہشام ابن سالم نقل کرتے ہیں کہ ایک روز زرارہ نے مجھ سے کہا: **لا تریٰ علیٰ اعوادھا غیر جعفر** (ع) مسند خلافت پر امام جعفرؑ ابن محمدؑ کے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھو گے۔ ہشام کہتے ہیں جب امام صادقؑ نے شہادت پائی تو میں نے زرارہ سے کہا: ''کیا تم کو اپنی وہ بات یاد ہے؟'' مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بھول نہ گئے ہوں مگر زرارہ نے کہا: ہاں مگر خدا کی قسم میں نے وہ بات اپنے اندازہ کے مطابق کہی تھی (مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ زرارہ نے وہ بات امام علیہ السلام سے نقل کی تھی)

متعدد روایتوں سے اصحاب ائمہؑ کی طرف سے قیام کی درخواست یا اس کے انتظار کا پتہ چلتا ہے اور اس سے اس بات کی واضح نشان دہی ہوتی ہے کہ ائمہ علیہم السلام کا ہدف ومقصد یعنی حکومت علوی کی تشکیل، اس کے لیئے تلاش وجستجو اور اس کا متوقع ہونا شیعیان آل محمد حتیٰ کہ ائمہؑ کے قریب ترین ساتھیوں کے درمیان مسلمات میں شمار ہوتا تھا اور یہ چیز ائمہؑ کے ہدف وحکمت عملی کا ایک قطعی قرینہ ہے۔

ایک دوسری بحث یہ ہے کہ ائمہ کے ساتھ خلفائے وقت کے بغض وعناد اور خصومت و دشمنی کی علت کیا تھی؟ آیا ان کے حسد کی وجہ محض ائمہؑ کی معنوی عظمت اور عوام میں ہر دل عزیزی تھی اور ان تمام دشمنیوں کی اصل بنیاد یہی چیز تھی؟ یا حقیقت امر کچھ اور ہے؟

یقیناً اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ائمہ علیہم السلام خلفاء نیز اس طرح کے دوسرے افراد کے حسد کا نشانہ رہے ہیں کہ جیسا کہ قرآن کی آیت: **ام یحسدون الناس علی ما آتیھم اللہ من فضلہ** کی تفسیر کے ذیل میں اس مضمون کی روایت موجود ہے کہ ''**نحن المحسودون**'' یعنی وہ لوگ جن سے لوگوں کا حسد کرنا اس آیت میں ذکر ہوا ہے ہم لوگ ہیں۔ پھر بھی یہ دیکھنا پڑے گا کہ ائمہؑ کے ساتھ لوگوں کے حسد کی بنیاد کیا ہے؟ کیا ان کے علم وتقویٰ سے لوگ حسد کرتے تھے؟ تو یہ سبھی جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایسے علماء وزہاد بھی موجود تھے جو انہی صفات کے ساتھ لوگوں میں

پہچانے جاتے تھے اور ان کے چاہنے والوں اور دوستوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر ابو حنیفہ، ابو یوسف، حسن بصری، سفیان ثوری، محمد بن شہاب اور اسی طرح کے دسیوں مشہور و معروف چہرے اس وقت موجود تھے، جن کے بڑی تعداد میں مطیع و خیر خواہ موجود تھے اور نہ صرف یہ کہ لوگوں کے درمیان مشہور تھے بلکہ ان کے محبوب بھی تھے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ خلفاء نے نہ فقط یہ کہ ان کے ساتھ بغض و حسد کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض خلفا کی محبت و ارادت کے مرکز بھی رہے ہیں۔

لہٰذا ہماری نظر میں ائمہؑ کے ساتھ خلفاء کی ایسی شدید دشمنی جو گرفتاری، دربدری، قید و بند اور پھر شہادت پر منتہی ہوتی ہے اس کی اصل علت کسی اور ہی چیز میں تلاش کرنی چاہیے۔ اور وہ خلافت و امامت کے سلسلہ میں ان حضراتؑ کا ادعا ہے جو دوسروں کے یہاں نہیں نظر آتا۔ یہ ان ہی بحثوں میں سے ایک بحث ہے جس پر تحقیق و تدقیق کئے جانے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ایک تحقیق طلب موضوع ائمہ علیہم السلام کے اصحاب کا آستانۂ خلافت کے ساتھ تیز و تند مقابلہ اور ٹکراؤ ہے جس کے نمونے ائمہؑ کی زندگی کے دوران بخوبی مشاہدہ کئے جا سکتے ہیں۔ حضرت سید سجادؑ کے زمانے میں جو سخت خفقان و گھٹن کا دور ہے یحییٰ بن ام طویل جو حضرت کے حوارئین میں سے تھے۔ مسجد مدینہ میں آتے تھے اور ان لوگوں سے جو یا تو دربار خلافت کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے تھے یا خلافت کے کارگزاروں میں سے تھے خطاب کرتے ہوئے قرآن کی وہ آیت پڑھتے تھے جس میں کفار سے جناب ابراہیمؑ کی گفتگو کا ذکر ہے: ''**کفرنا بکم و بدأ بیننا و بینکم العداوۃ و البغضاء...**'' اور اسی طرح کناسۂ کوفہ میں مجمع عام میں شیعوں کے ایک گروہ کو خطاب کرتے ہوئے بآواز بلند ایسی تقریر کرتے ہیں جس کا لفظ لفظ حکام وقت کی سیاست کے لیئے کھلا ہوا چیلنج تھا۔

معلیٰ ابن خنیس نماز عید کی ادائیگی کے لیئے جب لوگوں کے ہمراہ صحرا کی جانب جاتے تھے تو نہایت ہی پریشاں حال غیر مرتب لباس میں غمگین صورت بنائے وہاں پہونچتے تھے اور جیسے

ہی خطیب منبر پر جاتا تھا ہاتھوں کو بلند کر کے بآواز بلند کہتے تھے: ''**اللھم ان ھذا مقام خلفائک و اصفیائک و موضع امنائک... ابتزوھا**'' پروردگارا! یہ منبر اور یہ مقام تیرے منتخب اور برگزیدہ جانشینوں کا ہے جو فی الحال ان سے چھین لیا گیا ہے اور دوسروں نے اس پر اپنا پنجہ مضبوط کر لیا ہے۔

اور مقام افسوس ہے کہ یہ بلند مرتبہ صحابی جس کے قاتل پر امام صادق علیہ السلام لعن و نفرین کرتے ہوئے مقتول کی تعریف و توصیف فرماتے ہیں بعض افراد کی تنقید و بے مہری کا نشانہ بن کر ثقہ اور امین کی فہرست سے خارج کر دئے گئے ہیں اور بعید نہیں ہے کہ اس فکر کے پیچھے بھی بنو عباس کا خبیث ہاتھ کارفرما ہو۔

ایک اور مسئلہ جس کے لیئے کافی دقت اور بحث عمیق کی ضرورت ہے، مسئلہ تقیہ ہے۔ اصل میں تقیہ کا مورد اور عنوان سمجھنے کے لیئے لازم ہے کہ وہ تمام روایات جو کتمان و پردہ داری نیز خفیہ سرگرمیوں سے متعلق ہیں ان کی چھان بین کی جائے تا کہ ایک طرف تو ائمہ علیہم السلام کے اس ادعا اور ہدف کے پیش نظر جن کا گذشتہ بحثوں میں ذکر کیا جا چکا ہے اور دسری طرف خلفائے زمانہ کے اس شدید ردعمل کے پیش نظر جو ائمہ علیہم السلام اور ان کے اصحاب کی سرگرمی اور سیاسی فعالیت کے خلاف ظاہر ہوتا رہا ہے ـــــ تقیہ کا صحیح اور حقیقی مفہوم سمجھا جا سکے۔

البتہ ایک چیز جس میں کسی طرح کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے وہ یہ کہ تقیہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے یا تمام کام اور سعی و کوشش ترک کر دینے کا نام نہیں ہے بلکہ پوشیدہ طور پر حفاظت کا خیال رکھتے ہوئے اپنے کام کو جاری رکھنے کو تقیہ کہتے ہیں اور یہ بات بھرپور طور پر، روایتوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی روشن ہو جاتی ہے۔ یہ ائمہ علیہم السلام کی حیات طیبہ سے متعلق ضروری مباحث کا صرف ایک حصہ ہے ان بزرگان دین کی سیاسی زندگی سے مربوط بہت سی دوسری بحثیں بھی ہیں جن کی فہرست پیش کرنے کی بھی اب گنجائش نہیں ہے اگرچہ ان سے متعلق ضروری یادداشتیں میرے پاس اس وقت بھی موجود ہیں۔ بندہ نے ان تمام موضوعات موضوعات پر بڑی

تفصیل کے ساتھ کام کیا ہے مگر افسوس یہ ہے کہ اس وقت ان تمام چیزوں کو تدوین کرنے کی فرصت نہیں رہ گئی ہے۔ اے کاش! ایسے باہمت افراد پیدا ہو جاتے جو اس کام کو آگے بڑھاتے اور ائمہ علیہم السلام کی سیاسی زندگی بھی یکجا صورت میں لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ جاتی اور ہم ان عظیم ہستیوں کی زندگی کے ان تمام روشن پہلوؤں کو اپنے لیے درس اور نمونے کے عنوان سے اختیار کرتے نہ یہ کہ صرف ایک زندہ و پایندہ یادگار کے طور پر اس کا ذکر کر لینا ہی کافی سمجھ لیتے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آٹھویں امام حضرت علی رضا علیہ السلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

نام ونسب

علیؑ نام رضا لقب اور ابوالحسن کنیت۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام والد بزرگوار تھے اور اس لئے آپ کو پورے نام ولقب کے ساتھ یاد کیا جائے تو امام ابوالحسن علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کہا جائے گا۔ والدہ گرامی کی کنیت ام البنین اور لقب طاہرہ تھا نہایت عبادت گزار بی بی تھیں۔

ولادت

۱۱ رذیقعدہ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی اس کے تقریباً ایک ماہ قبل ۱۵ رشوال کو آپ کے جد بزرگوار امام جعفر صادقؑ کی وفات ہو چکی تھی۔ اتنے عظیم حادثہ مصیبت کے بعد جلد ہی اس مقدس مولود کے دنیا میں آجانے سے یقیناً تمام گھرانے میں ایک سکون اور تسلی محسوس کی گئی۔

تربیت

آپ کی نشونما اور تربیت اپنے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے زیر سایہ ہوئی۔ اور اسی مقدّس ماحول میں بچپنا اور جوانی کی متعدد منزلیں طے ہوئیں۔ اور پینتیس برس کی عمر پوری ہوئی۔ اگرچہ آخری چند سال اس مدت کے وہ تھے جب امام موسیٰؑ کاظم عراق میں قید وظلم کی سختیاں برداشت کر رہے تھے مگر اس سے پہلے ۲۸ یا ۲۹ برس آپ کو برابر اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

جانشینی

امام موسیٰ کاظمؑ کو معلوم تھا کہ حکومت وقت آپ کو آزادی سے سانس نہ لینے دیگی۔ اور ایسے حالات پیش آجائیں گے کہ آپ کے آخری عمر کے حصے میں اور دنیا کو چھوڑنے کے موقع پر دوستان اہلبیتؑ کا آپ سے ملنا یا بعد کے رہنما کا دریافت کرنا غیر ممکن ہوجائے گا۔ اس لئے آپ نے انھیں آزادی کے دنوں اور سکون کے اوقات میں جب کہ آپ مدینہ میں تھے پیروان اہلبیتؑ کو اپنے بعد ہونے والے امام سے روشناس بنانے کی ضرورت محسوس فرمائی۔ چنانچہ اولاد علیؑ و فاطمہؑ میں سے سترہ آدمی جو ممتاز حیثیت رکھتے تھے جمع فرما کر اپنے فرزند حضرت علی رضاؑ کی وصایت اور جانشینی کا اعلان فرمادیا اور ایک وصیت نامہ تحریراً بھی مکمل فرمایا جس پر مدینہ کے معززین میں سے ساٹھ آدمیوں کی گواہی لکھی گئی۔ یہ اہتمام دوسرے ائمہؑ کے یہاں نظر نہیں آتا۔ صرف ان خصوصی حالات کی بناء پر جن سے دوسرے ائمہؑ اپنی وفات کے موقع پر دوچار نہیں ہونے والے تھے۔

دور امامت

حضرت امام رضاؑ کی پینتیس برس کی عمر تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات ہوئی اور امامت کی ذمہ داریاں آپ کی طرف منتقل ہوئیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب بغداد میں ہارون الرشید تخت خلافت پر تھا اور بنی فاطمہ کے لئے حالات بہت ناسازگار تھے۔ اس ناخوش گوار ماحول میں حضرت نے خاموشی کے ساتھ شریعت حقہؑ کے خدمات انجام دینا شروع کردیئے۔

علمی کمال

آل محمدؐ کے اس سلسلے میں ہر فرد حضرت احدیت کی طرف سے بلند ترین علم کے درجہ پر قرار دی گئی تھی جسے دوست اور دشمن سب کو ماننا پڑتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو علمی فیوض پھیلانے کا زمانہ نے کم موقع دیا اور کسی کو زیادہ چنانچہ ان حضرات میں سے امام جعفر صادقؑ کے بعد اگر کسی کو سب سے زیادہ موقع حاصل ہوا ہے تو وہ امام رضا علیہ السلام ہیں۔ جب آپ امامت کے منصب پر

نہیں پہنچے تھے اس وقت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے تمام فرزندوں اور خاندان کے لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ تمہارے بھائی علی رضاؑ عالم آل محمدؐ ہیں۔ اپنے دینی مسائل کو ان سے دریافت کرلیا کرو اور جو کچھ وہ کہیں اسے یاد رکھو اور پھر حضرت موسیٰ کاظمؑ کی وفات کے بعد جب آپ مدینہ میں تھے اور روضۂ رسولؐ پر تشریف فرما رہتے تھے تو علماء اسلام مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ محمد ابن عیسیٰ یقطینی کا بیان ہے کہ میں نے ان تحریری مسائل کو جو حضرت امام رضاؑ سے پوچھے گئے تھے اور آپ نے ان کا جواب تحریر فرمایا تھا اکٹھا کیا تو اٹھارہ ہزار کی تعداد میں تھے۔

زندگی کے مختلف دور

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد دس برس ہارون کا دور رہا۔ یقیناً وہ امام رضاؑ کے وجود کو بھی دنیا میں اسی طرح پر برداشت نہیں کرسکتا تھا جس طرح اس کے پہلے آپ کے والد بزرگوار کا رہنا اس نے گوارہ نہیں کیا۔ مگر یا تو امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ جو طویل مدت تک تشدد اور ظلم ہوتا رہا اور جس کے نتیجہ میں قید خانہ ہی کے اندر آپ دنیا سے رخصت ہوگئے اس سے حکومت وقت کی عام بدنامی ہوگئی تھی اور یا واقعی ظالم کو خود اپنی بدسلوکیوں کا احساس اور ضمیر کی طرف سے ملامت کی کیفیت تھی جس کی وجہ سے کھُلم کھُلا امام رضاؑ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ایک دن یحییٰ ابن خالد برمکی نے اپنے اثر اور رسوخ کے بڑھانے کے لئے یہ کہا بھی کہ علیؑ ابن موسیٰ بھی اب اپنے باپ کے بعد امامت کے اسی طرح دعوے دار ہیں۔ تو ہارون نے جواب دیا کہ جو کچھ ہم نے ان کے باپ کے ساتھ کیا وہی کیا کم ہے جواب تم چاہتے ہو کہ میں اس نسل ہی کا خاتمہ کردوں۔

پھر بھی ہارون رشید کا اہلبیت رسولؐ سے شدید اختلاف اور سادات کے ساتھ جو برتاؤ اب تک رہا تھا اس کی بنا پر عام طور سے عمّال حکومت یا عام افراد بھی جنھیں حکومت کو راضی رکھنے کی خواہش تھی اہلبیتؑ کے ساتھ کوئی اچھا رویّہ رکھنے پر تیار نہیں ہوسکتے تھے۔ اور نہ امام کے پاس

آزادی کے ساتھ لوگ استفادہ کے لئے آسکتے تھے۔ نہ حضرت کو سچے اسلامی احکام کی اشاعت کے مواقع حاصل تھے۔

ہارون کا آخری زمانہ اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کی باہمی رقابتوں سے بہت بے لطفی میں گذرا۔ امین پہلی بیوی سے تھا جو خاندان شاہی سے منصور دوانیقی کی پوتی تھی۔ اور اس لئے عرب سردار سب اس کے طرفدار تھے۔ اور مامون ایک عجمی کنیز کے پیٹ سے تھا۔ اس لئے دربار کا عجمی طبقہ اس سے محبت رکھتا تھا۔ دونوں کی آپس میں رسہ کشی ہارون کے لئے سوہان روح بنی رہتی تھی۔ اس نے اپنے خیال میں اس کا تصفیہ مملکت کی تقسیم کے ساتھ یوں کر دیا کہ دارالسلطنت بغداد اور اس کے چاروں طرف کے عربی حصے جیسے شام، مصر، حجاز، یمن وغیرہ محمد امین کے نام کئے گئے اور مشرقی ممالک جیسے ایران، خراسان، ترکستان وغیرہ مامون کے لئے مقرر کئے گئے۔ مگر یہ تصفیہ تو اس وقت کارگر ہوسکتا تھا جب دونوں فریق ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر عمل کرتے ہوتے۔

لیکن جہاں اقتدار کی ہوس کارفرما ہو وہاں اگر بنی عباس کے ہاتھوں بنی فاطمہ کے خلاف ہر طرح کے ظلم و تعدی کی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے تو خود بنی عباس میں ایک گھر کے اندر دو بھائی اگر ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں تو کیوں نہ ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائیاں کرنے پر تیار نظر آئے۔ اور کیوں نہ ان طاقتوں میں باہم تصادم ہو جب کہ ان میں سے کوئی اس ہمدردی اور ایثار اور خلق خدا کی خیرخواہی کا بھی حامل نہیں ہے۔ جسے بنی فاطمہ اپنے پیش نظر رکھ کر اپنے واقعی حقوق سے چشم پوشی کرلیا کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ادھر ہارون کی آنکھ بند ہوگئی اور ادھر بھائیوں میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ آخر چار برس کی مسلسل کشمکش اور طویل خوں ریزی کے بعد مامون کو کامیابی ہوئی اور اس کا بھائی امین محرم ۱۹۸ھ میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور مامون کی خلافت تمام بنی عباس کے حدود سلطنت پر قائم ہوگئی۔

ولی عہدی

امین کے قتل ہونے کے بعد سلطنت تو مامون کے پائے نام ہوگئی۔ مگر یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ

امین ننھیال کی طرف سے عربی النسل تھا اور مامون عجمی النسل۔ امین کے قتل ہونے سے عراق کی عرب قوم اور ارکان سلطنت کے دل مامون کی طرف سے صاف نہیں ہوسکتے تھے۔ بلکہ ایک غم وغصہ کی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ دوسری طرف خود بنی عباس میں سے ایک بڑی جماعت جو امین کی طرفدار تھی اس سے بھی مامون کو ہر وقت خطرہ لگا ہوا تھا اولاد فاطمہ میں سے بہت سے لوگ جو وقتاً فوقتاً بنی عباس کے مقابل میں کھڑے ہوتے رہے تھے وہ خواہ قتل کر دیئے گئے ہوں یا جلاوطن کئے گئے ہوں یا قید رکھے گئے ہوں۔ ان کے بھی موافق ایک جماعت تھی جو اگر حکومت کا کچھ بگاڑ نہ بھی سکتی تب بھی دل ہی دل میں حکومت بنی عباس سے بیزار ضرور تھی۔

ایران میں ابومسلم خراسانی نے بنی امیہ کے خلاف جو اشتعال پیدا کیا تھا وہ ان مظالم ہی کو یاد دلا کر جو بنی امیہ کے ہاتھوں حضرت امام حسینؑ اور دوسرے بنی فاطمہ کے ساتھ ہوئے تھے اس سے ایران میں اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کا پیدا ہونا فطری تھا۔ درمیان میں بنی عباس نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا۔ مگر اتنی مدت میں کچھ نہ کچھ تو ایرانیوں کی آنکھیں بھی کھلی ہی ہوں گی کہ ہم سے کہا گیا تھا اور اقتدار کن لوگوں نے حاصل کرلیا۔ ممکن ہے کہ ایرانی قوم کے ان رجحانات کا چرچہ مامون کے کانوں تک بھی پہنچا ہو۔ اب جس وقت کہ امین کے قتل کے بعد وہ عرب قوم پر اور بنی عباس کے خاندان پر بھروسہ نہیں کرسکتا تھا اور اسے ہر وقت اس حلقہ سے بغاوت کا اندیشہ تھا۔ تو اسے سیاسی مصلحت اسی میں معلوم ہوئی کہ عرب کے خلاف عجم اور بنی عباس کے خلاف بنی فاطمہ کو اپنا بنایا جائے اور چونکہ طرز عمل میں خلوص سمجھا نہیں جاسکتا اور وہ عالم طبائع پر اثر نہیں ڈال سکتا اگر یہ نمایاں ہوجائے کہ وہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہے۔ اس لئے ضرورت ہوئی کہ مامون مذہبی حیثیت سے اپنی شیعیت اور ولائے اہلبیتؑ کے چرچے عوام کے حلقوں میں پھیلائے اور یہ دکھلائے کہ وہ انتہائی نیک نیتی سے اب ''حق بحق دار رسید'' کے مقولہ کو سچا بنانا چاہتا ہے۔

اس سلسلہ میں جیسا کہ جناب شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہ نے تحریر فرمایا ہے اس نے اپنی نذر کی حکایت کی بھی تشہیر کی کہ جب امین کا اور میرا مقابلہ تھا اور بہت نازک حالت تھی اور عین اسی وقت

میرے خلاف سیستان اور کرمان میں بھی بغاوت ہوگئی تھی اور خراسان میں بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور میری مالی حالت بھی ابتر تھی اور فوج کی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا تو اس سخت اور دشوار ماحول میں میں نے خدا سے التجا کی اور منت مانی کہ اگر یہ سب جھگڑے ختم ہو جائیں اور میں خلافت تک پہنچوں تو اس کو اس کے اصلی حقدار یعنی اولاد فاطمہ میں سے جو اس کا اہل ہے اس تک پہنچا دوں گا۔ اسی نذر کے بعد سے میرے سب کام بننے لگے اور آخر تمام دشمنوں پر مجھے فتح حاصل ہوئی۔

یقیناً یہ واقعہ مامون کی طرف سے اس لئے بیان کیا گیا کہ اس کا طرز عمل خلوص قلب اور حسن نیت پر مبنی سمجھا جائے۔ یوں تو اہلبیتؑ کے جو کھلے ہوئے سخت سے سخت دشمن تھے۔ وہ بھی ان کی حقیقت اور فضیلت سے واقف تھے ہی اور ان کی عظمت کو جانتے تھے مگر شیعیت کے معنی صرف یہ جاننا تو نہیں ہیں۔ بلکہ محبت رکھنا اور اطاعت کرنا ہیں اور مامون کے طرز عمل سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اس دعویٰ شیعیت اور محبت اہلبیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود امام کی اطاعت نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ امام کو اپنے منشاء کے مطابق چلانے کی کوشش تھی۔ ولی عہد بننے کے بارے میں آپ کے اختیارات کو بالکل سلب کر دیا گیا اور آپ کو مجبور بنا دیا گیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ یہ ولی عہدی کی تفویض بھی ایک حاکمانہ تشدد تھا جو اس وقت شیعیت کے بھیس میں امام کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔

امام علیہ السلام کا اس ولی عہدی کو قبول کرنا، بالکل ایسا ہی تھا جیسا ہارون کے حکم سے امام موسیٰ کاظمؑ کا جیل خانہ چلا جانا۔ اسی لئے جب امام رضاؑ مدینہ منورہ سے خراسان کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو آپ کے رنج، صدمہ اور اضطراب کی کوئی حد نہ تھی روضۂ رسولؐ سے رخصت کے وقت آپ کا وہی عالم تھا جو حضرت امام حسینؑ کا مدینہ سے روانگی کے موقع پر تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ بیتابانہ روضہ کے اندر جاتے ہیں اور نالۂ وآہ کے ساتھ اُمت کی شکایت کرتے ہیں پھر باہر نکل کر گھر جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر دل نہیں مانتا پھر روضہ سے جا کر لپٹ جاتے ہیں یہی صورت کئی مرتبہ ہوئی۔ راوی کا بیان ہے کہ میں حضرت کے قریب گیا تو فرمایا اے محول (حالات کو بدل دینے والے) میں اپنے جد امجد کے روضہ سے بہ جبر جدا کیا جا رہا ہوں اب مجھ کو یہاں واپس آنا نصیب نہ

ہوگا۔

۲۰۰ھ میں حضرت مدینہ منورہ سے خراسان کی جانب روانہ ہوئے اہل وعیال اور متعلقین سب کو مدینہ ہی میں چھوڑ گئے اس وقت امام محمد تقی علیہ السلام کی عمر پانچ برس کی تھی آپ بھی مدینہ ہی میں رہے جب حضرت مرو پہنچے جو اس وقت دار السلطنت تھا تو مامون نے چند روز ضیافت وتکریم کے مراسم ادا کرنے کے بعد قبول خلافت کا سوال پیش کیا، حضرت نے اس سے اسی طرح انکار کیا جس طرح امیر المومنینؑ چوتھے موقع پر خلافت پیش کئے جانے کے وقت انکار فرما رہے تھے مامون کو خلافت سے دست بردار ہونا در حقیقت منظور نہ تھا ورنہ وہ امام کو اسی پر مجبور کرتا چنانچہ جب حضرتؑ نے خلافت کے قبول کرنے سے انکار فرمایا تو اس نے ولی عہدی کا سوال پیش کیا۔ حضرتؑ اس کے بھی انجام سے واقف تھے۔ نیز بخوشی جابر حکومت کی طرف سے کوئی منصب قبول کرنا آپ کے مذہبی اصول کے خلاف تھا۔ حضرت نے اس سے بھی انکار فرمایا۔ مگر اس پر مامون کا اصرار جبر کی حد تک پہنچ گیا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ اس کو منظور نہیں کر سکتے تو آپ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

جان کا خطرہ قبول کیا جا سکتا ہے جب مذہبی مفاد کا قیام جان دینے پر موقوف ہو ورنہ حفاظت جان شریعت اسلام کا بنیادی حکم ہے۔ امام نے فرمایا: یہ ہے تو میں مجبوراً قبول کرتا ہوں، مگر کاروبار سلطنت میں بالکل دخل نہ دوں گا۔ ہاں اگر کسی بات میں مجھ سے مشورہ لیا جائے گا تو نیک مشورہ ضرور دوں گا، اس کے بعد یہ ولی عہدی صرف برائے نام سلطنتِ وقت کے ایک ڈھکوسلے سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ جس سے ممکن ہے کچھ عرصہ تک کسی سیاسی مقصد میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہو۔ مگر امام کی حیثیت اپنے فرائض کے انجام دینے میں بالکل وہ تھی جو ان کے پیش رَو حضرت علیؑ مرتضیٰ اپنے زمانہ کی باقتدار طاقتوں کے ساتھ اختیار کر چکے تھے۔ جس طرح ان کا کبھی کبھی مشورہ دے دینا ان حکومتوں کو صحیح وجائز نہیں بنا سکتا تھا ویسے ہی امام رضاؑ کا اس نوعیت سے ولی عہدی کا قبول فرمانا اس سلطنت کے جواز کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف مامون کی ایک راج ہٹ

تھی جو اس طرح پوری ہوگئی۔ مگر امام نے اپنے دامن کو سلطنت ظلم کے اقدامات اور نظم و نسق سے بالکل الگ رکھا۔

بنی عباس مامون کے اس فیصلے سے قطعاً متفق نہ تھے۔ انھوں نے بہت کچھ دراندازیاں کیں، مگر مامون نے صاف کہہ دیا کہ علی رضاؑ سے بہتر کوئی دوسرا شخص تم بتادو۔ اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے مناظرے بھی ہوئے۔ مگر ظاہر ہے کہ امام کے مقابلے میں کس کی علمی فوقیت ثابت ہوسکتی تھی۔ مامون کا فیصلہ اٹل تھا اور وہ اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہ تھا۔ نہ کوئی دوسرا دلائل سے اُسے قائل کرسکتا تھا کہ وہ اپنے فیصلہ کو بدل دیتا۔

یکم ماہ رمضان ۲۰۱ھ روز پنجشنبہ جلسۂ ولی عہدی منعقد ہوا۔ بڑی شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ یہ تقریب عمل میں لائی گئی۔ سب سے پہلے مامون نے اپنے بیٹے عباس کو اشارہ کیا اور اس نے بیعت کی پھر اور لوگ بیعت سے شرف یاب ہوئے۔ سونے اور چاندی کے سکے سر مبارک پر نثار کئے گئے اور تمام ارکان سلطنت و ملازمین کو انعامات تقسیم ہوئے۔ مامون نے حکم دیا کہ حضرت کے نام کا سکہ تیار کیا جائے۔ چنانچہ درہم و دینار پر حضرت کے نام کا نقش ہوا اور تمام قلمرو میں وہ سکہ چلایا گیا جمعہ کے خطبہ میں حضرت کا نام داخل کیا گیا۔

اخلاق و اوصاف

مجبوری اور بے بسی کا نام قناعت یا درویشی ''عصمت بی بی از بے چادری'' کے مقولہ کے موافق اکثر ابنائے دنیا کا شعار رہتا ہے مگر ثروت و اقتدار کے ساتھ فقیرانہ زندگی اختیار کرنا بلند مرتبہ مردان خدا کا حصہ ہے۔ اہلبیت معصومینؑ میں سے جو بزرگوار ظاہری حیثیت سے اقتدار کے درجہ پر نہ تھے اور اکثر یہ حضرات ایسے ہی تھے وہ عموماً اچھے لباس اور شان کے ساتھ رہتے تھے۔ کیونکہ ان کی فقیری کو دشمن بے بسی پر محمول کر کے طعن و تشنیع پر آمادہ ہوتے اور حقانیت کے وقار کو ٹھیس لگتی مگر جو بزرگ اتفاقاتِ روزگار سے ظاہری اقتدار کے درجہ پر پہنچ گئے۔ انھوں نے اتنا ہی فقر اور سادگی کے مظاہرہ میں اضافہ کردیا تاکہ ان کی زندگی غریب مسلمانوں کی تسلی کا ذریعہ بنے اور ان کے لئے

نمونہ عمل ہو۔ جیسے امیر المومنین حضرت علیؑ مرتضیٰ، چونکہ شہنشاہ اسلام مانے جارہے تھے اس لئے آپ کا لباس اور طعام ویسا زاہدانہ تھا جس کی مثال دوسرے معصومینؑ کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی صورت حضرت علی رضاؑ کی تھی۔ آپ مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کے ولی عہد بنائے گئے تھے جس کے وسعت مملکت کے سامنے روم و فارس کا ذکر بھی طاقِ نسیاں کی نذر ہوگیا تھا۔ جہاں اگر بادل سامنے سے گزرتا تو خلیفہ کی زبان سے آواز بلند ہوتی تھی کہ ''جا جہاں تجھے برسنا ہو برس، بہرحال تیری پیداوار کا خراج میرے ہی پاس آئے گا۔''

حضرت امام رضاؑ کا اس سلطنت و ولی عہدی پر فائز ہونا دنیا کے سامنے ایک نمونہ تھا کہ دین والے اگر دنیا کو پاجائیں تو ان کا رویہ کیا ہوگا۔ یہاں امام رضاؑ کو اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ضرورت تھی کہ زہد اور ترک دنیا کے مظاہرے اتنے ہی نمایاں تر بنادیں۔ جتنے تزک و احتشام کے دنیاوی تقاضے زیادہ ہیں۔ چنانچہ تاریخ نے اپنے کو دہرادیا اور علی رضاؑ کے لباس میں علیؑ مرتضیٰ کی سیرت دنیا کی نگاہوں کے سامنے آگئی۔ آپ نے اپنی دولت سرا میں قیمتی قالین بچھوانا پسند نہیں کئے بلکہ جاڑے میں بالوں کا کمبل اور گرمی میں چٹائی کا فرش ہوا کرتا تھا۔ کھانا سامنے لایا جاتا تو دربان، سائیس اور تمام غلاموں کو بلا کر اپنے ساتھ کھانے میں شریک فرماتے تھے۔ داب و آداب شاہی کے خوگر ایک بلخی شخص نے ایک دن کہہ دیا کہ حضور اگر ان لوگوں کے کھانے کا انتظام الگ ہوجایا کرے تو کیا حرج ہے۔ حضرت نے فرمایا ''خالق سب کا اللہ ہے۔ ماں سب کی حوّا اور باپ سب کے آدمؑ ہیں۔ جزا و سزا ہر ایک کی اس کے عمل کے مطابق ہوگی۔ پھر دنیا میں تفرقہ کس لئے ہو''۔

اسی عباسی سلطنت کے ماحول کا ایک جزو بن کر جہاں صرف پیغمبر کی طرف ایک قرابت داری کی نسبت کے سبب اپنے کو خلق خدا پر حکمرانی کا حقدار بتایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ کبھی اپنے اعمال و افعال پر نظر نہ کی جاتی تھی کہ ہم کیسے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا کہ بنی عباس ظلم و ستم اور فسق و فجور میں بنی امیہ سے کم نہ رہے بلکہ بعض باتوں میں ان سے آگے بڑھ گئے

اور اس کے ساتھ پھر بھی قرابت رسولؐ پر افتخار تھا۔ اس ماحول کے اندر داخل ہو کر امام رضاؑ کا اس بات پر بڑا زور دینا کہ قرابت کوئی چیز نہیں اصل انسان کا عمل ہے۔ بہ ظاہر صرف ایک شخص کا اظہار فروتنی اور انکسار نفس تھا جو بہر حال ایک اچھی صفت ہے لیکن حقیقت میں وہ اس سے بڑھ کر تقریباً ایک صدی کی عباسی سلطنت کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کے خلاف اسلامی نظریہ کا اعلان تھا اور اس حیثیت سے بڑا اہم ہو گیا تھا کہ وہ اب اسی سلطنت کے ایک رکن کی طرف سے ہو رہا تھا۔ چنانچہ امام رضاؑ کی سیرت میں اس کے مختلف شواہد ہیں۔ ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ ''خدا کی قسم آباؤ اجداد کے اعتبار سے کوئی شخص آپ سے افضل نہیں۔'' حضرت نے فرمایا میرے آباؤ اجداد کو جو شرف حاصل ہوا تھا وہ بھی صرف تقویٰ، پرہیزگاری اور اطاعت خدا سے۔'' ایک شخص نے کسی دن کہا کہ ''واللہ آپ بہترین خلق ہیں'' حضرت نے فرمایا ''اے شخص حلف نہ اُٹھا جس کا تقویٰ و پرہیزگاری مجھ سے زیادہ ہو وہ مجھ سے افضل ہے۔''

ابراہیم بن عباس کا بیان ہے کہ حضرت فرماتے تھے ''میرے تمام لونڈی غلام آزاد ہو جائیں اگر اس کے سوا کچھ اور ہو کہ میں اپنے کو محض رسولؐ اللہ کی قرابت کی وجہ سے اس سیاہ رنگ غلام سے بھی افضل نہیں جانتا (حضرت نے اشارہ کیا اپنے ایک غلام کی جانب) ہاں جب عمل خیر بجالاؤں تو اللہ کے نزدیک اس سے افضل ہوں گا۔''

یہ باتیں کوتاہ نظر لوگ صرف ذاتی انکسار پر محمول کر لیتے ہوں۔ مگر خود حکومت عباسیہ کا فرمانروا یقیناً اتنا کُند ذہن نہ ہوگا کہ وہ ان تازیانوں کو محسوس نہ کرے جو امام رضاؑ کے خاموش افعال اور اس طرح کے اقوال سے اس کے خاندانی نظام سلطنت پر برابر لگ رہے تھے۔ اس نے تو بخیال خود ایک وقتی سیاسی مصلحت سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے کے لئے حضرت کو ولی عہد بنایا تھا مگر بہت جلد اُسے محسوس ہوا کہ اگر ان کی زندگی زیادہ عرصے تک قائم رہی تو عوام کی ذہنیت میں یک لخت انقلاب ہو جائے گا اور عباسی سلطنت کا تختہ ہمیشہ کے لئے اُلٹ جائے گا۔

عزائے حسینؑ کی اشاعت

اب امام رضاؑ کو تبلیغ حق کے لئے نام حسینؑ کی اشاعت کے کام کو ترقی دینے کا بھی پورا موقع حاصل ہو گیا تھا، جس کی بنیاد اس کے پہلے حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ قائم کر چکے تھے۔ مگر وہ زمانہ ایسا تھا کہ امام کی خدمت میں وہی لوگ حاضر ہوتے تھے جو بحیثیت امام یا بحیثیت عالم دین آپ کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے اور اب امام رضاؑ تو امام روحانی بھی ہیں اور ولی عہدِ سلطنت بھی۔ اس لئے آپ کے دربار میں حاضر ہونے والوں کا دائرہ وسیع ہے، مرو کا مقام ہے جو ایران کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ ہر طرف کے لوگ یہاں آتے تھے اور یہاں یہ عالم کہ ادھر محرم کا چاند نکلا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دوسروں کو بھی ترغیب و تحریص کی جانے لگی کہ آل محمدؐ کے مصائب کو یاد کرو اور تاثرات غم کو ظاہر کرو

یہ بھی ارشاد ہونے لگا کہ ''جو اس مجلس میں بیٹھے جہاں ہماری باتیں زندہ کی جاتی ہیں۔ اس کا دل مردہ نہ ہوگا اس دن کہ جب سب کے دل مردہ ہوں گے۔''

تذکرۂ امام حسینؑ کے لئے جو مجمع ہو اس کا نام اصطلاحی طور پر ''مجلس'' اسی امام رضاؑ کی حدیث ہی سے ماخوذ ہے۔ آپ نے عملی طور پر بھی خود مجلسیں کرنا شروع کر دیں۔ جن میں کبھی خود ذاکر ہوئے اور دوسرے سامعین جیسے ریّان بن شبیب کی حاضری کے موقع پر جو آپ نے مصائب امام حسینؑ بیان فرمائے اور کبھی عبداللہ بن ثابت یا دعبل خزاعی ایسے کسی شاعر کی حاضری کے موقع پر اس شاعر کو حکم ہوا کہ تم ذکرِ امام حسینؑ میں اشعار پڑھو وہ ذاکر ہوا اور حضرت سامعین میں داخل ہوئے۔

دعبل کو حضرت نے بعد مجلس ایک قیمتی حلہ بھی مرحمت فرمایا جس کے لینے میں دعبل نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ مجھے قیمتی حلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے جسم کا اترا ہوا لباس مرحمت فرمائیے تو حضرت نے ان کی خوشی پوری کی۔ وہ حلہ انھیں دیا ہی اس کے علاوہ ایک جُبّہ اپنے پہننے کا بھی مرحمت فرمایا۔

اس سے ذاکر کا بلند طریقۂ کار کہ اسے کسی دنیاوی انعام کی خاطر یا معاذ اللہ اجرت طے

کر کے ذاکری نہیں کرنا چاہئے اور بانی مجلس کا طریقۂ کار کہ وہ بغیر طے کئے ہوئے کچھ بطور پیش کش ذاکر کی خدمت میں پیش کرے۔ دونوں امر ثابت ہیں مگر ان مجالس میں سامعین کے اندر کسی حصہ کی تقسیم ہرگز کسی معتبر کتاب سے ثابت نہیں ہوتی۔

وفات

مامون کے توقعات غلط ثابت ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ آخر امام کی جان لینے کا درپے ہوگیا اور وہی خاموش حربہ جوان معصومینؑ کے ساتھ اس کے پہلے بہت دفعہ استعمال کیا جاچکا تھا کام میں لایا گیا۔ انگور میں جو بطور تحفہ امام کے سامنے پیش کئے گئے تھے، زہر دیا گیا اور اس کے اثر سے ۱۷ر صفر ۲۰۳ھ میں حضرت نے شہادت پائی۔ مامون نے بظاہر بہت رنج وماتم کا اظہار کیا اور بڑے شان وشکوہ کے ساتھ اپنے باپ ہارون رشید کے قریب دفن کیا۔

جہاں مشہد مقدس میں حضرت کا روضہ آج تاجداران عالم کی جبیں سائی کا مرکز بنا ہوا ہے وہیں اپنے وقت کا بزرگ ترین دنیاوی شہنشاہ ہارون رشید بھی دفن ہے۔ جس کا نام ونشان تک وہاں جانے والوں کو معلوم نہیں ہوتا۔

حضرت امام علی رضاؑ

حجۃ الاسلام مولانا سید محسن مظفر نقوی صاحب نبیرۂ حکیم الامت علامہ ہندیؒ

نیشاپور میں امام۔ کاؤ رود

عیون اخبار الرضاؑ اور مناقب ابن شہر آشوب میں ہے کہ ابو واسع محمد نیشاپوری اپنی دادی خدیجہ بنت حمدان سے روایت کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت امام علی رضا ؑ نیشاپور میں وارد ہوئے تو عربی محلہ میں بلاشاباذ (یا بلاشاباد) کے مقام پر میری دادی کے یہاں فروکش ہوئے۔ اس جگہ کو اس وجہ سے ''پسندہ'' کہا جاتا ہے کہ امام رضا ؑ نے اسے اپنے لئے پسند فرمایا تھا۔[۱]

کتاب تاریخ نیشاپور میں محمد بن ابی سعد بن عبدالکریم وزان سے نقل کیا گیا ہے کہ جناب علی بن موسی الرضاؑ نیشاپور میں وارد ہوئے۔ یہ ایک ایسا سفر تھا جس سے حضرتؑ کے اختصاص وامتیاز کا اندازہ ہوتا ہے جو حضرتؑ ہی کے لئے تھا۔[۲] حضرت ایک ہودج میں تشریف فرما تھے جو ایک خچّر پر رکھا ہوا تھا۔ جب حضرتؑ کی سواری نیشاپور کے چہار بازار میں پہنچی تو دو محدثین جن کے نام ابوزاعہ اور محمد بن اسلم طوسی تھے حضرتؑ کے پاس آئے اور کہا:[۳] اے سید! سادات کے بیٹے، اے امام، اے فرزند ائمہؑ، اے سلالۂ طاہرۂ مرضیہ، اے خلاصۂ زاکیہ نبویہ، آپ کو آپ کے پاک بزرگوں اور نفوس قدسیہ کی قسم اپنا چہرۂ تابناک ظاہر فرمایئے اور خلق کو اپنے نور سے منور فرمایئے، اور ایک شعر پڑھا جس کا ترجمہ ہے کہ:

''اپنے چہرۂ مقدس سے نقاب اٹھایئے تاکہ خلق اللہ ایک روز میں دو سورجوں کو عیاں دیکھ لے۔ اور آپؑ مجھ سے کوئی حدیث بھی بیان فرمایئے۔ تاکہ میں ہمیشہ اس حدیث کو یاد رکھوں اور

---

[۱] عیون اخبار الرضا ج، ۲ ص ۱۳۳ / مناقب ابن شہر آشوب، ج ۲ ص ۳۹۸

[۲] کشف الغمۃ، ص ۱۷۱ [۳] عیون اخبار الرضا، ج ۲ ص ۱۳۴-۱۳۳

میرے لئے ہمیشہ کے لئے مایۂ افتخار ہوجائے۔'' حضرتؑ نے یہ عرض داشت سنی تو ایک نظر نقاب پر ڈالی، ہودج کے پردہ کو اوپر کی طرف اٹھایا اور مسلمین کی آنکھیں سورج کی سی روشنی سے خیرہ ہوگئیں۔ حضرتؑ نورانی صورت لئے، دو خوبصورت گیسو مثل گیسوانِ رسولؐ خدا شانے پر پڑے ہوئے نمودار ہوئے۔ لوگوں نے حضرت کے مرکب کو گھیر لیا۔ بعض حضرات نے تو وفورِ جذبات سے اپنے کپڑے تک چاک کر دیئے۔ بعض نے ہوش و حواس ایسے کھوئے کہ منہ زمین سے رگڑنے لگے۔ جو لوگ نزدیک تھے وہ ہاتھ پیر، بال، زین اور رکاب تک چوم رہے تھے، اور اس حالت کو دیکھ کر بہت سے لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، لیکن یہ فرطِ انبساط کی اشکباری تھی غم و اندوہ کی نہیں۔[۱] اسی ہنگامے میں نیشاپور کے قاضیوں اور محدثوں نے پکار کے کہا:

''اے گروہِ مردُم! گوش برآواز ہوجاؤ کہ امامؑ وقت، سبطِ نبیؐ، حاملِ احکام شریعت کی زبان کھلتی ہے۔''

یہ سننا تھا کہ لوگ یکدم خاموش ہوگئے اور آپ نے حدیث سلسلۃ الذہب ارشاد فرمائی، اس کو لکھنے والوں کی تعداد ۲۴ ہزار تھی۔ جو لوگ محض سن رہے تھے وہ بے شمار تھے۔

حدیث سلسلۃ الذہب

قَالَ عَلِیُّ بْنُ مُوسَی الرِّضَا عَلَیْهِ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ مُوْسٰی بْنُ جَعْفَرٍ الْکَاظِمُ عَلَیْهِ السَّلَامُ : قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ جَعْفَرُ بْنُ مُحَمَّدٍ الصَّادِقُ عَلَیْهِ السَّلَامُ : قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِیٍّ الْبَاقِرِ عَلَیْهِ السَّلَامُ : قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ عَلِیُّ بْنُ الْحُسَیْنِ عَلَیْهِ السَّلَامُ : قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ حُسَیْنُ بْنُ عَلِیٍّ شَهِیْدِ اَرضِ کَرْبَلَا : قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ شَهِیْدِ اَرْضِ الْکُوْفَةِ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَخِیْ وَ ابْنُ عَمِّیْ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اٰلِهٖ قَالَ حَدَّثَنِیْ جِبْرَئِیْلُ قَالَ سَمِعْتُ رَبَّ الْعِزَّةِ سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی: کَلِمَةُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حِصْنِیْ وَ مَنْ دَخَلَ حِصْنِیْ اَمِنَ مِنْ عَذَابِیْ۔[۲]

---

[۱] تاریخ نیشاپور [۲] یہ حدیث عیون اخبار الرضاؑ، منتخب التواریخ، اعیان الشیعہ، کشف الغمۃ، مناقب ابن شہر آشوب، اخبار و آثار امام رضاؑ، زندگانی امام رضاؑ میں مختلف الفاظ میں درج کی گئی ہے۔

''علی بن موسیٰ الرضا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا مجھ سے حدیث بیان کی میرے والد ماجد موسیٰ بن جعفر الکاظم علیہ السلام نے کہا حدیث بیان کی مجھ سے میرے والد جعفر بن محمد الصادق نے کہا حدیث بیان کی میرے والد محمد بن علی الباقر نے کہا حدیث بیان کی میرے والد علی بن الحسین نے کہا حدیث بیان کی میرے والد حسین ابن علیؑ شہید ارض کربلا نے، کہا حدیث بیان کی مجھ سے میرے والد امیر المومنین علی بن ابی طالب۔ شہید ارض کوفہ نے کہا حدیث بیان کی مجھ سے میرے بھائی اور ابن عم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا حدیث بیان کی مجھ سے جبرئیل نے کہا میں نے رب العزت سبحانہٗ وتعالیٰ سے سنا کہا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ میرا قلعہ ہے اور جو میرے قلعہ میں داخل ہوا وہ میرے عذاب سے بچ گیا۔

نیشاپور میں حضرت امام علی رضاؑ سے بہت سے خوارق عادات امور ظاہر ہوئے اور آپؑ نے علم و حکمت کے بے پناہ موتی رولے۔ یہاں سے نکل کر آپؑ ''دہ سرخ'' پہنچے۔

امام مرو میں

مشہور مؤرخ مسعودی نے ''اثبات الوصیۃ'' میں اور شیخ مفیدؒ نے ''الارشاد'' میں لکھا ہے کہ جب امام رضا –کے پہنچنے کی خبر ''مرو'' پہنچی تو مامون نے حکم دیا کہ استقبال کے تمام لوازم تیار کیے جائیں اور امراء و پیشوا اور بزرگان شہر سب کے سب حضرتؑ کے استقبال کے لئے جائیں۔ مامون خود بڑھا اور اس نے امامؑ کا استقبال کیا اور حضرتؑ کی عزت و تعظیم و تکریم بجا لایا اور لوگوں کے سامنے ایک خطبہ میں حضرتؑ کی فضیلت آشکار کی۔[۱]

آپؑ کو ولی عہدی کی پیش کش

حضرت امام علی رضا –جب مرو تشریف لائے تو
شیخ مفیدؒ کے قول کے مطابق مامون نے چند روز توقف کیا، پھر آپؑ پر اپنا مدعا ظاہر کیا۔

---

[۱] اثبات الوصیۃ، ص ۱۷۶/ ارشاد، ص ۲۸۲

فصل الخطاب میں محمد پارسا نے لکھا ہے کہ جب مرو میں امام رضا - مامون کے پاس پہنچے تو اس نے خلافت قبول کرنے کے لئے عرض کیا۔ امام - نے قبول نہ فرمایا اور ارشاد فرمایا! خدائے عزوجل کی قسم مجھے زہد اور دنیا سے بے رغبتی پر فخر ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے کو مکرم و محترم کرنے کی کوشش میں ہوں مجھے تمہارے عہدے کی کوئی ضرورت نہیں۔[۱] پارسا نے مزید لکھا ہے کہ مامون کے اصرار پر آپ نے روتے ہوئے خلافت کے بجائے ولی عہدی قبول کی۔

ابن طقطقی نے لکھا ہے کہ امام - ''مرو'' پہنچے اور مامون نے آپ کو مجبور کیا کہ عہدۂ خلافت آپؑ قبول فرمالیں لیکن آپ نے کہا کہ میں اس امر کو قبول نہیں کرسکتا، مامون نے کہا کہ اگر ایسا نہیں کرسکتے تو ولی عہدی قبول فرمالیں، آپ نے بہ جبر و اکراہ قبول فرمایا۔[۲]

حضرتؑ کی ولی عہدی اور بنو عباس کا امتحان

مامون (مؤرخین کے مطابق) اہلبیتؑ سے بہت عقیدت رکھتا تھا اور خاص طور پر امام علی رضا - سے تو اس کو بہت محبت تھی۔[۳]

شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں (یعنی ۲۰۱ھ میں) حضرت علی رضا - امام ہشتم موجود تھے، جن سے مامون دِلی ارادت رکھتا تھا اور چونکہ زہد و تقدس کے علاوہ ان کا فضل و کمال بھی خلافت کے شایان تھا، مامون نے ان کو ولی عہد کرنا چاہا۔ اس سے قبل اس نے ۲۰۰ھ میں فرامین بھیجے کہ تمام ممالک میں جس قدر عباسی خاندان کے لوگ ہیں آستانۂ خلافت میں حاضر ہوں۔ (ابن کثیر کے بقول) اس زمانہ میں ۳۳ ہزار عباسی دنیا میں موجود تھے یہ سب کے سب آستانۂ خلافت پر جمع ہوئے اور مامون نے ان سب کا استقبال کیا اور یہ لوگ پورے سال شاہی مہمان کی حیثیت سے رہے۔ مامون نے اس عرصہ میں ہر ایک کو امتحان کی نگاہ سے دیکھا (مامون کیونکہ خود بہت عالم و فاضل شخص تھا) وہ سمجھ گیا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو خلافت کے بارگراں کو برداشت

---

[۱] فصل الخطاب، ص ۲۷۳ [۲] الفخری، ص ۲۶۲ [۳] المامون، ص ۷۳

کر سکے۔ حضرت علی بن موسی الرضا - کو وہ خلافت کا اہل سمجھتا تھا چنانچہ اس نے ۲۰۱ھ میں اعیان سلطنت اور اراکین دربار پر مشتمل ایک دربار منعقد کیا اور اس میں سب سے خطاب کر کے کہا کہ آج دنیا میں جس قدر آل عباس ہیں میں ان کی لیاقت کا صحیح اندازہ کر چکا ہوں، نہ ان میں اور نہ آل علیؑ میں کوئی شخص ایسا ہے جو استحقاقِ خلافت میں آپؑ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔[۱]

حضرت امام رضا - کا مامون کی بیٹی سے عقد

مؤرخ طبری کے مطابق ۲۰۲ھ میں مامون نے حسن بن سہل کی لڑکی بوران دخت سے شادی کی نیز اپنی بیٹی ام حبیب کی شادی امام علی الرضاؑ سے اور دوسرے بیٹی ام الفضل کی شادی محمد بن علی بن موسیٰ سے کی۔[۲] حافظ ابوالقاسم عبدالکریم بن محمد بن عبدالکریم الرافعی الشافعی القزوینی نے ''التدوین'' میں لکھا ہے کہ احمد بن محمد کی روایت ہے کہ انھوں نے یحییٰ بن اکثم کو کہتے سنا کہ جب مامون نے اپنی بیٹی کی شادی علی الرضاؑ سے کرنا چاہی تو مجھ سے کہا کہ تم تقریر کرو اور اس میں ان کی جلالت شان بیان کرو۔ میں نے کہا اے امیر المومنین! آپ حاکم اکبر ہیں اور مجھ سے زیادہ کلام پر قادر ہیں آپ ہی تقریر کریں۔ مامون نے کہا:

الحمد لِلّٰہ الذی تصاغرت الامور لمشیتہ۔ ولا اِلٰہَ الّا اللّٰہ اقرارًا بربوبیتہ وصلی اللّٰہ علی محمّد عبدہ، امّا بعد! فانّ اللّٰہ تعالیٰ جعل النکاح الذی رضیہ حکمًا وانزلہ وحیًا سببًا للمناسبۃ، الّا وانّی قدزوجت ابنتی من علی بن موسیٰ الرّضا ومھرتھا والسّلام۔[۳]

حضرتؑ کی شہادت کے اسباب اور اس پر جامع تبصرہ

جیسا کہ آپ اوپر پڑھ آئے ہیں مامون اور اس کا دست راست ذوالریاستین دونوں ہی امام رضا - کے خلاف تھے گو کہ مامون کو اہلبیتؑ کی فضیلت کا اقرار تھا لیکن حکومت حاصل کرنے اور

---

[۱] المامون، ص ۷۳-۷۲ [۲] طبری، ج ۸ ص ۳۲۹-۳۲۸/ ابن الاثیر، ج ۶ ص ۳۵۰

[۳] التدوین، ج ۴ ص ۵۲/ احقاق الحق، ج ۱۲ ص ۳۸۷-۳۸۶

مضبوط کرنے کی خاطر جب مامون نے اپنے بھائی امین کے قتل کی پرواہ نہیں کی اور اس کا سر دیکھ کر فرطِ مسرّت سے سرشار ہو گیا، تو کیسے ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے کو بخش دیتا؟

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ بنو عباس حضرت امام علی رضا -کی ولی عہدی سے سخت ناراض تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مامون کو معزول کر کے اس کے چچا ابراہیم کو اپنا سربراہ قرار دے لیا تھا، لیکن مامون کو اتنے بڑے واقعہ کی قطعاً کوئی خبر نہیں مل سکی تھی، اس موقع پر ابراہیم کے اشعار مسعودی نے نقل کئے ہیں۔[۱]

فلا جزیت بنو العباس خیراً
علی زغمی ولا اغتبطت بری

بنو عباس کو جزائے خیر نہ ملے اگرچہ یہ میری خواہش کے خلاف ہے اور نا قابل رشک سیرابی انھیں حاصل ہو۔

اتونی مهطحین وقد اتاهم
بوار الدهر بالخبر الجلی

وہ میرے پاس بڑے تذلل کے ساتھ آئے کیونکہ ان پر زمانے کی ہلاکت علانیہ بربادی کی خبر لئے ہوئے آچکی ہے۔

وقد ذهلی الحواضن عن بینها
وصد الثدی عن فم الصبی

حالت یہ تھی کہ مائیں اپنے بچوں کو بھول چکی تھیں اور بچے کے منہ سے چھاتی ہٹالی گئی تھی۔

وحل عصائب الاملاک منها
فشدّت فی رقاب فی علیؑ

عصابۂ حکومت بنی عباس کے گلے سے اتار کر بنی علیؑ کی گردنوں میں باندھ دیئے گئے تھے۔

---

[۱] التنبیہ والاشراف، ص ۲۴۳-۲۴۲

فضجت ان تشد علی رووس
تطالبها بمیراث النبیؐ

بنو عباس چیخ اٹھے تھے کہ مبادا یہ دستار ایسے سروں پر نہ بندھے جو رسول اللہ ﷺ کی میراث کا ان سے مطالبہ کرتے تھے۔

ابراہیم کے خلیفہ بن جانے کے بعد دو اہم واقعات رونما ہوئے، یہ فضل اور امام علی رضا -کے قتل تھے۔ اس کی تفصیل محمد بن علی بن علی بن طباطبا نے الفخری میں یوں لکھی ہے :

مامون نے سیاہ لباس اتار کر سبز لباس پہننے کا فرمان جاری کر دیا۔ یہ سب کچھ خراسان میں ہوا، بغداد میں جب عباسیوں نے یہ سنا کہ مامون نے خلافت کو عباسی گھرانے سے علوی گھرانے میں منتقل کر دیا اور ان کے آباؤ اجداد کے لباس کے رنگ کو بدل کر سبز کر دیا تو وہ برافروختہ ہو گئے اور اس سے ناراض ہو کر اس کو خلافت سے معزول کر دیا اور اس کے چچا ابراہیم بن مہدی کی بیعت لے لی۔ یہ ابراہیم بہت فاضل، شاعر، فصیح، ادیب اور غضب کا موسیقار تھا چنانچہ افراس بن حمدان اپنے قصائد میں کہتا ہے کہ:

منکم عُلَیَّةُ ام منهم وکان لکم
شیخ المغنین ابراهیم ام لهم

(بحر طویل)

عُلَیَّہ تم میں سے ہے یا ان میں سے؟ اور موسیقاروں کا استاد ابراہیم تمہارا ہے یا ان کا؟[۱]

آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

فضل بن سہل مامون تک خبریں نہیں پہنچنے دیتا تھا، بلکہ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ کوئی شخص مامون کے پاس پہنچ کر اسے خبر دے آیا ہے تو وہ اسے ایذا پہنچاتا اور سزائیں دیتا تھا، اس لئے لوگوں

---

[۱] الفخری، ص ۲۶۳ / طبری، ج ۸ ص ۳۲۸-۳۲۶ / ابن خلدون، ج ۳ ص ۱۷۵

نے مامون سے ایسی باتیں کرنا ترک کردی تھیں اور اسے ضروری اطلاعات نہیں پہنچ پاتی تھیں۔ انتہا یہ ہے کہ جب بغداد میں فتنوں نے سر اٹھایا اور مامون کو معزول کر کے ابراہیم بن مہدی کی بیعت کر لی گئی اور عباسی حضرات مامون کے فعل سے برافروختہ ہو گئے تو فضل بن سہل نے اس خبر کو بھی مدتوں مامون سے چھپائے رکھا، آخر کار علی بن موسی الرضا - مامون کے پاس گئے اور مامون سے فرمایا کہ بغداد کے لوگوں نے میری ولی عہدی کی بیعت کرنے سے اور لباس کا رنگ بدلنے سے انکار کر دیا ہے اور آپ کو معزول کر کے آپ کے چچا ابراہیم بن المہدی کی بیعت کر لی ہے۔ علی بن موسی الرضاؑ نے جرنیلوں کی ایک جماعت کو بھی اس خبر کی تصدیق کے لئے بلوایا۔ مامون نے جب ان جرنیلوں سے حالات دریافت کئے تو وہ خاموش رہے اور کہا کہ ہمیں فضل کا ڈر ہے اگر آپ ہمیں اس کے شر سے بچانے کا ذمہ لیں تو ہم سب باتیں آپ کو بتادیں۔ مامون نے اپنے ہاتھ سے پروانۂ امان لکھ دیا تو انھوں نے تمام حالات بیان کر دیئے اور فضل کی خیانت سے آگاہ کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ فضل مامون کو کس طرح اندھیرے میں رکھتا ہے اور خبروں کو اس سے چھپاتا ہے۔ انھوں نے مامون کو یہ بھی رائے دی کہ آپ خود بغداد جا کر اس کا تدارک کیجئے ورنہ آپ کے ہاتھ سے خلافت نکل جائے گی۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد فضل بن سہل اور امام علی رضا - کا قتل ظہور میں آیا۔[۱]

ان واقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہیں کہ فضل بن سہل اور امام علی رضا - کو مامون ہی نے قتل کروایا تھا۔ فضل کو تو اس کی بددیانتی کی سزا ملی اور امام رضا - کی ولی عہدی کے ردّعمل کے طور پر، کیونکہ بنوعباس مامون کے خلاف ہو گئے تھے اور انھوں نے مامون کے چچا ابراہیم بن مہدی کو خلیفہ بنالیا تھا۔ مامون نے جب یہ دیکھ لیا کہ امام علی رضا - کے ولی عہد ہوتے ہوئے میری خلافت وحکومت مضبوط نہیں ہو سکتی تو جس طرح اس نے اپنے بھائی امین پر لشکر کشی کر کے اپنی راہ سے ہٹا دیا اسی طرح حضرت امام علی رضا - کو بھی شہید کرا دیا۔

---

[۱] الفخری، ص ۶۵-۶۴

شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ ''شیعہ بلا استثناء اس پر متفق ہیں کہ خود مامون نے زہر دلوایا، افسوس ہے کہ ہم کو شیعوں کی تاریخی تصنیفات نہیں ملیں کہ ہم اس بحث کو دونوں فریق کی روایتوں کے لحاظ سے فیصل کر سکتے، تمام وہ بڑی بڑی تصنیفیں جن کو دنیا نے اسلامی تاریخ کا لقب دیا ہے سنّیوں ہی کی تصنیفیں ہیں، اور بظاہر ان میں مذہبی حیثیت کا خاص خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ تاریخی واقعات کی نسبت سے ہم کو انھیں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے ایک مؤرخ نے بھی مامون پر یہ الزام لگانے کی جرأت نہیں کی ہے بلکہ علامہ ابن اثیر نے صاف لفظوں میں اس غلط خیال پر استعجاب کا اظہار کیا ہے۔ مامون الرشید کے زمانہ سے نہایت قریب تر تاریخ جو آج تک دستیاب ہو سکتی ہے ابن واضح یعقوبی کی تاریخ ہے۔ یہ مصنف مامون کے زمانہ کے واقعات کو ان لوگوں کی زبانی روایت کرتا ہے جو خود مامون کے عہد میں موجود تھے۔ ہم اس کی تاریخ میں شیعیت کا اثر بھی پاتے ہیں تاہم اس نے مامون کے بجائے یہ بدگمانی علی بن ہشام کی نسبت کی ہے۔ تاریخی اصولِ تحقیق سے اگر ہم کام لیں تو بھی یہ ماننا پڑے گا کہ مامون نے حضرت امام علی رضا - کو ولی عہدِ خلافت مقرر کیا تو اس سے اس کو کوئی سازش مقصود نہ تھی۔ حضرت علی رضاؑ کوئی سیاسی شخص نہ تھے نہ ان سے حکومت عباسیہ کو کسی خطرہ کا احتمال تھا جیسا کہ شیعوں کا دعویٰ ہے۔ مامون کو اہلبیتؑ سے جو دلی خلوص تھا اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ حضرت علی رضاؑ کے بعد مامون کا طریق عمل سادات کے ساتھ کیا رہا؟ اس خاص حیثیت سے مامون کے ان تمام حالات وواقعات کو ترتیب دو جو حضرت علی رضاؑ کی وفات سے پہلے اور بعد میں پیش آئے۔ یہ مرتب اور نتیجہ خیز سلسلہ خود بتادے گا کہ مامون پر غلط اتہام ہے، بے شبہ مامون کے خاندان والے حضرت علی رضاؑ کی ولی عہدی سے ناراض تھے۔ انھیں میں سے کسی نے یہ بے ہودہ حرکت کی ہوگی۔''[۱]

مولانا شبلی نعمانی کے اس بیان میں چند غلطیاں ہیں جن کی وضاحت نہایت ضروری ہے:

۱- مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ بڑی بڑی تاریخی کتابیں سنّیوں ہی نے لکھی ہیں اور ان

---

[۱] المامون شبلی نعمانی، ص ۸۳

کے خیال ودعوے کے مطابق کسی ایک مؤرخ نے بھی یہ الزام مامون پر عائد کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ابن اثیر نے تو صاف صاف لفظوں میں اس پر استعجاب کا اظہار کیا ہے۔

ہم یہ مان لیتے ہیں کہ بڑی بڑی تاریخی کتابیں سنّیوں کی تصانیف ہیں اور شیعوں نے کوئی قابل ذکر تاریخ نہیں لکھی لیکن ابن اثیر کی حیرت واستعجاب کا اس کی تاریخ میں کوئی پتا نہیں ملتا۔ ابن اثیر نے تو اپنی تاریخ میں ۲۰۳ھ کے واقعات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اسی سنہ میں علی بن موسی الرضا ؑ نے انتقال فرمایا۔ ان کی موت کا سبب انگور بنے جو انھوں نے کھائے تھے، یہ انگور تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ ان کا انتقال اچانک ہوا، یہ صفر کے آخری ایام کی بات ہے، آپ نے طوس میں انتقال کیا، مامون نے آپ کی نماز پڑھائی اور آپؑ کو رشید کے پاس دفن کیا۔ جب انھیں دفن کیا جارہا تھا تو مامون اپنے والد کی قبر کے پاس کھڑا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مامون نے آپ کو انگوروں میں زہر دیا تھا اور انگور آپ کو بہت پسند تھے۔''[۱]

اب اثیر کے علاوہ طبری[۲] اور ابن خلدون[۳] نے بھی اس واقعہ کو لکھا ہے۔ اس دعوے میں مسعودی، ابن طباطبا، شبلنجی، محمد بن طلحہ شافعی وغیرہ بھی شریک ہیں۔[۴] ان کے علاوہ روضۃ الصفا، صفحہ ۲۰، جامع التواریخ، صفحہ ۱۴۹، شواہد النبوہ، صفحہ ۲۵۳، صواعق محرقہ، صفحہ ۱۲۲، فصول المہمۃ، صفح ۲۷۸، ینابیع المودۃ، صفحہ ۲۶۳، پر بھی اس بات کا اعتراف موجود ہے لیکن مولانا شبلی کے پیش نظر یہ کتابیں نہیں رہیں یا پھر انھوں نے تجاہل عارفانہ برتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲- مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ حضرت علی رضا ؑ کوئی ملکی شخصیت نہیں تھے اور نہ ہی مامون کو ان سے کوئی خطرہ تھا۔ یہ بھی بڑی لغوبات ہے کیونکہ خود شبلی صاحب نے اس بات کو لکھا ہے کہ بنوعباس ان کی ولی عہدی سے ناراض تھے اور اس قدر برہم تھے کہ انھوں نے مامون کو معزول کرکے اس کے

---

[۱] ابن اثیر الکامل فی التاریخ، ج ۶ ص ۳۵۱

[۲] طبری، ج ۸ ص ۳۲۹ [۳] ابن خلدون، ج ۳ ص ۱۷۷

[۴] مسعودی، مروج الذہب، ج ۶ ص ۳۳ / ابن طباطبا، الفخری، ص ۲۶۵ / شبلنجی، نورالابصار، ص ۱۴۴ / محمد بن طلحہ شافعی، مطالب السئول، ص ۲۸۸

چچا ابراہیم بن مہدی کو خلیفہ بنالیا تھا اور بغداد میں مامون کے خلاف بہت شورش برپا ہوئی تھی، اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ کہنا کہ مامون کو آپ سے کوئی خطرہ نہ تھا، ایک عجیب سی بات ہے۔

مامون کا جو طرز عمل سادات کے ساتھ تھا ہم اسے مامون کے عہد کے سیاسی حالات میں بیان کرآئے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مامون نے آپؑ کو شہید کرنے کے بعد بنوعباس اور اہل بغداد کو لکھا کہ ''تم لوگ ان کی ولی عہدی سے ناراض تھے، اب ان کا انتقال ہوگیا ہے، اب تم لوگ میری اطاعت وفرمانبرداری کرو۔'' لیکن اس پر ایسے سخت خطوط لکھے گئے کہ کسی کو نہ لکھے گئے۔[۱]

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مامون نے محض اپنے اقتدار کی خاطر آپؑ کو شہید کیا اور اپنی دانست میں یہ خوش خبری (معاذ اللہ) اہل بغداد کو بھیجی، آپ کے صاحبزادے اور امام وقت حضرت امام محمد تقی الجواد ؑ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی لیکن مامون آپ سے نہ مل سکا۔[۲] صفر کی آخری تاریخوں میں یہ آفتاب امامت سرزمین سناباد (موجودہ مشہد مقدس ایران) میں غروب ہوگیا۔ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔''[۳]

---

[۱] طبری، ج ۸ ص ۳۲۹ / ابن اثیر، ج ۶ ص ۲۵۱ / ابن خلدون، ج ۳ ص ۱۷۷

[۲] جلاء العیون، ج ۲ ص ۳۸۰-۳۷۸ [۳] اعیان الشیعہ، ۲/ ۴ ص ۱۰۵ / ابن اثیر، ج ۶ ص ۳۵۱

امام رضا علیہ السلام کو ولی عہدی کی پیشکش

مولانا سید محسن مظفر نقوی اجتہادی، کراچی

حضرت امام علی رضا علیہ السلام جب مرو تشریف لائے تو شیخ مفیدؒ کے قول کے مطابق مامون نے چند روز توقف کیا، پھر آپؑ پر اپنا مدعا ظاہر کیا۔ (ارشاد، ص ۲۸۲)

فصل الخطاب میں محمدؒ پارسا نے لکھا ہے کہ جب مرو میں امام رضا علیہ السلام مامون کے پاس پہنچے تو اس نے خلافت قبول کرنے کے لئے عرض کیا۔ امام علیہ السلام نے قبول نہ فرمایا اور ارشاد فرمایا: خدائے عزوجل کی قسم مجھے زہد اور دنیا سے بے رغبتی پر فخر ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے کو مکرم و محترم کرنے کی کوشش میں ہوں مجھے تمہارے عہدے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (فصل الخطاب، ص ۲۷۳) پارسا نے مزید لکھا ہے کہ مامون کے اصرار پر آپ نے روتے ہوئے خلافت کے بجائے ولی عہدی قبول کی۔

ابن طقطقی نے لکھا ہے کہ امام علیہ السلام مرو پہنچے اور مامون نے آپ کو مجبور کیا کہ عہدۂ خلافت آپ قبول فرمالیں لیکن آپ نے کہا کہ میں اس امر کو قبول نہیں کرسکتا، مامون نے کہا کہ اگر ایسا نہیں کرسکتے تو ولی عہدی قبول فرمالیں، آپ نے بہ جبر و اکراہ قبول فرمایا۔ (الفخری، ص ۲۶۲)

حضرتؑ کی ولی عہدی اور بنو عباس کا امتحان

مامون (مؤرخین کے مطابق) اہلبیتؑ سے بہت عقیدت رکھتا تھا اور خاص طور پر امام علی رضا علیہ السلام سے تو اس کو بہت محبت تھی۔ (المامون، ص ۷۳) شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں (یعنی ۲۰۱ھ میں) حضرت علی رضا علیہ السلام امام ہشتم موجود تھے، جن سے مامون دِلی ارادت رکھتا تھا اور چونکہ زہد و تقدس کے علاوہ ان کا فضل و کمال بھی خلافت کے شایان تھا، مامون نے ان کو

ولی عہد کرنا چاہا۔ اس سے قبل اس نے ۲۰۰ھ میں فرامین بھیجے کہ تمام ممالک میں جس قدر عباسی خاندان کے لوگ ہیں آستانۂ خلافت میں حاضر ہوں۔ (ابن کثیر کے بقول) اس زمانہ میں ۳۳ ہزار عباسی دنیا میں موجود تھے یہ سب کے سب آستانۂ خلافت پر جمع ہوئے اور مامون نے ان سب کا استقبال کیا اور یہ لوگ پورے سال شاہی مہمان کی حیثیت سے رہے۔ مامون نے اس عرصہ میں ہر ایک کو امتحان کی نگاہ سے دیکھا (مامون کیونکہ خود بہت عالم و فاضل شخص تھا) وہ سمجھ گیا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو خلافت کے بارِگراں کو برداشت کرسکے۔ حضرت علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کو وہ خلافت کا اہل سمجھتا تھا چنانچہ اس نے ۲۰۱ھ میں اعیانِ سلطنت اور اراکین دربار پر مشتمل ایک دربار منعقد کیا اور اس میں سب سے خطاب کرکے کہا کہ آج دنیا میں جس قدر آلِ عباس ہیں میں ان کی لیاقت کا صحیح اندازہ کرچکا ہوں، نہ ان میں اور نہ آل علیؑ میں کوئی شخص ایسا ہے جو استحقاقِ خلافت میں آپؑ کی ہمسری کا دعویٰ کرسکے۔

(المامون، ص ۷۳-۷۲)

حضرتؑ کی بیعت

۲۰۱ھ میں مامون نے حضرت علی بن موسی الرضا بن جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب علیہ السلام کو مسلمانوں کا ولی عہد اور اپنے بعد خلیفہ مقرر کیا اور ان کو "**الرضی من آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم**" کا لقب دیا اور فوج کو حکم دیا کہ سیاہ لباس ترک کرکے سبز لباس پہنیں۔

(ابن الاثیر، ج ۶ ص ۳۲۶/ طبری، ج ۸ ص ۲۱۷/ ابن خلدون، ج ۳ ص ۱۷۱)

طبری (طبری جلد ۸ صفحہ ۲۱۷) نے لکھا ہے کہ عیسیٰ بن محمد بن ابی خالد اپنی چھاؤنی سے بغداد آکر اپنی سپاہ کے معائنہ ہی میں مصروف تھا کہ اس کے پاس حسن بن سہل کا خط آیا جس میں اس نے عیسیٰ کو اطلاع دی تھی کہ امیر المومنین مامون نے علی بن موسی بن جعفر بن محمد بن علی بن الحسین بن علی ابن ابی طالبؑ کو اپنے بعد اپنا ولی عہد مقرر کیا ہے اس انتخاب سے پہلے انھوں نے

بنوعباس اور بنوعلیؑ کے ہر شخص پر غور کیا مگر ان سے بہتر، زیادہ متقی اور پرہیزگار اور عالم دین ان کو دوسرا نظر نہیں آیا، انھوں نے رضا آلِ محمدؐ ان کا لقب قرار دیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں سیاہ لباس ترک کر کے اب سبز لباس اختیار کروں۔ یہ خط عیسیٰ کو ۲ رمضان ۲۰۱ھ کو ملا یہ منگل کا روز تھا۔ اس خط میں حسن بن سہل نے اُسے یہ بھی حکم دیا کہ اپنے پاس والوں، سپاہ، افسر اور بنوہاشم کو حکم دے کہ وہ علی الرضاؑ کی بیعت کریں اور تمام پوشاک قبا، کلاہ اور عمامہ سبز پہنا کریں، اور تمام بغداد والوں سے اس پر عمل کرایا جائے۔

(طبری، ج ۸ ص ۳۱۷ / ابن خلدون، ج ۳ ص ۱۱۷ / ابن الاثیر، ج ۶ ص ۳۳۶)

بنوعباس کا ردِّ عمل اور ابراہیم کی بیعت

اس بیعت پر بنوعباس کا ردِّ عمل بہت سخت ہوا، ان میں سے بعض نے تو خوف سے بیعت کر لی لیکن ایک بڑی اکثریت بنوعباس کی اس امر کے خلاف تھی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ خلافت بنوعباس سے نکل کر بنوعلیؑ میں چلی جائے۔ ابن خلدون کے مطابق اس مخالفت اور برہمی کے بانی مبانی دو شخص تھے منصور اور ابراہیم، یہ دونوں مہدی کے بیٹے تھے اور جو کچھ کمی ان دونوں نے مخالفت میں کی اس کو مطلب بن عبداللہ بن مالک، سندی، نصر صیف اور صالح صاحب المصلی نے پورا کر دیا، نتیجتاً اہل بغداد نے ذی الحجہ میں مامون کو اپنے طور پر معزول کر کے ابراہیم بن المہدی سے بیعت خلافت کر لی۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ ذی الحجہ کا مہینہ ختم ہونے میں پانچ روز باقی تھے کہ ابراہیم بن المہدی کی بیعت کی گئی۔ (ابن الاثیر، ج ۶ ص ۳۳۷ / ابن خلدون، ج ۳ ص ۱۷۲ / طبری، ج ۸ ص ۳۱۷ /) طبری نے لکھا ہے کہ ۲۰۲ھ میں اہل بغداد نے ابراہیم بن المہدی کو خلیفہ بنایا اور مبارک اس کا لقب قرار دیا۔ بیان کیا گیا ہے کہ اہل بغداد نے یکم محرم کو ابراہیم کی بیعت کی تھی اور مامون سے علاحدگی اختیار کر لی تھی، جمعہ کے دن ابراہیم منبر پر چڑھا، سب سے پہلے عبداللہ بن عباس بن محمد الہاشمی نے بیعت کی۔ اس کے بعد منصور بن المہدی نے، اس کے بعد تمام بنی ہاشم نے پھر دوسرے فوجیوں نے بیعت کی۔ بیعت لینے کا کام مطلب بن عبداللہ بن مالک کے سپرد تھا۔ اس نے

اس معاملہ میں بہت کوشش کی تھی۔ اسی کے ساتھ سندی، صالح صاحب المصلی، منجاب اور نصیر خدمت گار بھی اس کے منصرم تھے۔ (طبری، ج ۸ ص ۳۱۹) ابراہیم کے سپہ سالاروں نے کافی قتل و غارت گری کی۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کا طرزِ عمل

حضرت امام علی رضا علیہ السلام اس تمام صورت حال کو بچشم خود ملاحظہ فرما رہے تھے۔ ان کو اس امر کا پورا پورا اندازہ تھا کہ بنوعباس آپؑ کی ولی عہدی سے کسی حد تک ناراض ہیں اور وہ اس کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں، دوسری طرف فضل بن سہل اور حسن بن سہل کا عوام سے جو سلوک تھا اور جس کی وجہ سے اہل بغداد ہی نہیں بلکہ ہر علاقہ کے لوگ مامون سے بیزار تھے، امام اس کا بھی مشاہدہ کر رہے تھے۔ امام علیہ السلام اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ مامون نے ولی عہد بنا کر بظاہر آپؑ پر جو اعتماد کیا ہے اس کو آپؑ کس طرح نبھائیں گے، چنانچہ آپؑ نے مامون سے ایک روز اس کا تذکرہ کیا۔ طبری نے اپنی کتاب ''الرسل والملوک'' میں لکھا ہے کہ علی بن موسیٰ بن جعفرؑ نے مامون کو اس فتنہ وفساد اور جنگ وجدل سے مطلع کیا جس میں سب لوگ امین کے قتل کے بعد سے اب تک مبتلا تھے۔ آپؑ نے یہ بھی فرمایا کہ فضل بن سہل نے کبھی آپ کو ملک کے اصلی حالات کی اطلاع نہیں دی بلکہ ہمیشہ ان کو آپ سے چھپایا ہے۔ خود آپؑ کے خاندان والے بعض باتوں کی وجہ سے آپ سے ناراض ہیں اور آپ کے متعلق کہتے ہیں کہ مسحور و مجنون ہو گئے ہیں۔ آپ کی اس بے خبری کو دیکھ کر انھوں نے آپ کے چچا ابراہیم بن المہدی کو اپنا خلیفہ مقرر کر لیا ہے۔ مامون نے کہا جہاں تک مجھے معلوم ہے انھوں نے ابراہیم کو خلیفہ نہیں بلکہ حکومت چلانے اور انتظام قائم رکھنے کے لئے محض اپنا امیر بنا لیا ہے فضل نے مجھ سے یہی کہا ہے۔ علی الرضاؑ نے کہا فضل آپ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ اور اس نے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ ابراہیم اور حسن بن سہل کے درمیان عرصہ سے لڑائی جاری ہے اور وہ لوگ آپ سے اسی وجہ سے ناراض ہیں کہ آپ نے فضل اور حسن کو کیوں اتنا سر پر چڑھا رکھا ہے۔ نیز مجھ سے جو آپ کے خاص تعلقات ہیں اور آپ نے جو مجھے اپنا ولی عہد بنایا ہے یہ بات بھی ان کو

سخت ناگوار ہے۔ مامون نے جب یہ سنا تو ششدر رہ گیا لیکن اس نے دوسرے لوگوں سے تصدیق چاہی۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ یحییٰ بن معاذ، عبدالعزیز بن عمران اور چند قومی امراء ان واقعات سے بخوبی واقف ہیں۔ مامون نے ان کو لانے کا حکم دیا، انھوں نے جان کی امان کی درخواست کی، مامون نے خود اپنے ہاتھ سے امان لکھ دی تو ان لوگوں نے امام علیہ السلام کی باتوں کی تصدیق کی۔ جب مامون سرخس پہنچا تو لوگوں نے فضل بن سہل کو حمام میں پا کر تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ یہ چار افراد غالب المسعودی الاسود، قسطنطین الرومی، فرج الدیلمی اور موفق الصقلبی تھے۔ یہ چاروں مامون کے خدمتگار تھے۔ فضل کے قاتلوں کا انعام مقرر کر دیا گیا تو عباس بن الہیثم بن بزرجمہر الدینوری انھیں پکڑ کر لایا، مامون کے سامنے جب یہ لوگ پہنچے تو انھوں نے کہا کہ آپ ہی نے تو ہمیں حکم دیا تھا۔ لیکن مامون کے حکم سے ان کی گردنیں اُڑا دی گئیں۔ (طبری، جلد ۸ ص ۳۲۶)

امام رضا علیہ السلام کا نمازِ عید کے لئے جانا اور لوگوں کا اشتیاق زیارت

ایک دفعہ جب عید کا دن آیا تو مامون نے حضرتؑ سے کہلا بھیجا کہ آپ سواری پر جا کر لوگوں کو نمازِ عید پڑھا دیں۔ حضرتؑ نے انکار کیا اور کہا کہ میں حکومت کے کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گا، لیکن مامون برابر زور دیتا رہا۔ آپؑ نے فرمایا مجھے معاف رکھو ورنہ میں اسی طرح نمازِ عید پڑھانے جاؤں گا جس طرح میرے جدِ امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے جاتے تھے۔ مامون نے کہا آپ کو اختیار ہے جس طرح جی چاہے جائیں۔ اس کے بعد اس نے سواروں اور پیادوں کو حکم دیا کہ حضرتؑ کے دولت کدہ پر حاضر ہوں۔ جب یہ خبر شہر میں مشہور ہوئی تو لوگ اشتیاق دیدار میں سڑکوں پر جمع ہو گئے اور عورتیں مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئیں تا کہ حضرت امام رضا علیہ السلام کے مرکب کی زیارت کر سکیں۔

ادھر آفتاب نکلنے کے بعد حضرت نے غسل کیا اور کپڑے بدلے۔ سفید عمامہ سر پر باندھا، عطر لگایا، عصا ہاتھ میں لے کر عیدگاہ کی طرف روانہ ہوئے اس کے بعد غلاموں اور نوکروں کو حکم دیا کہ تم

بھی غسل کر کے اور کپڑے بدل کر اسی طرح پیدل چلو۔ حضرتؑ نے پائجامہ آدھی پنڈلی تک اٹھا لیا۔ کپڑوں کو سمیٹا اور ننگے پاؤں ہو گئے۔ پھر دو تین قدم چل کر ٹھہرے اور سر آسمان کی طرف بلند کر کے اللہ اکبر، اللہ اکبر کہا۔ حضرت کے ساتھ نوکروں اور غلاموں نے بھی تکبیر کہی۔ راوی کا بیان ہے کہ جب آپؑ تکبیر کہتے تھے تو ہمیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ در و دیوار آپ کی تکبیر کا جواب دے رہے ہیں۔ اس ہیبت کو دیکھ کر یہ حالت ہوئی کہ سب لوگ اور خود لشکر والے زمین پر گر پڑے۔ سب کی حالت بدل گئی، لوگوں نے چھریوں سے جوتیوں کے تسمے کاٹ دیئے اور جلدی جلدی جوتیاں اتار کر ننگے پاؤں ہو گئے۔ شہر بھر کے لوگ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ شہر میں ایک کہرام بپا ہو گیا۔ اس کی خبر مامون کو ہوئی۔ سہل بن سہل نے کہا کہ اگر یہی حالت رہی تو پتا نہیں ہمارا کیا بنے، سب لوگ انھیں کی طرف ہو جائیں گے۔ مامون فوراً بھانپ گیا اور اس نے ایک آدمی کو بھیج کر درخواست کی کہ آپ کو اس طرح بہت زحمت ہو رہی ہے، آپ واپس تشریف لے آئیں جو ہر سال نماز پڑھاتا تھا وہی پڑھا لے گا، بعد میں مامون نے خود نماز پڑھائی۔

(وسیلۃ النجاۃ، ص ۳۸۲ / نور الابصار، ص ۱۴۳ / اخبار آثار، ص ۹۹)

❁❁❁

امام رضا علیہ السلام

مترجمہ: محترمہ بنت زہرا نقوی ندیؔ الہندی صاحبہ لکھنؤ

مامون کی سیاست کا تجزیہ امام رضاؑ اور ان کا طریقۂ کار

ائمہ عترت چونکہ دنیا کے ہر گوشہ اور ہر دور کے لئے نمونہ ہیں، اس لئے خداوند تعالیٰ نے انھیں ہر طرح کے حالات سے دوچار رکھا تا کہ ہر حالت میں ان کا کردار، طریقۂ کار اور حکمت عملی آئندہ نسلوں کے لئے ایک نمونۂ جاوید رہے۔ لہٰذا اس تابناک سلسلۂ عصمت کی ہر فرد خاص قسم کے مختلف حالات سے دوچار رہی اور مختلف قسم کے حالات میں حق کی پاسداری، حقیقت کے تحفظ، ''پیغام'' کی تبلیغ و ترویج اور اس کی 'چارہ سازی' (Tactics) اور اسٹریٹجی کے لئے مخصوص طریقۂ کار کا انتخاب کیا۔ ائمہ کے رکھ رکھاؤ کو سمجھنے اور ان سے اپنی رہنمائی پانے کے لئے ہمیں چاہئے کہ دشمن کے حالات، اسلوب اور اسٹریٹجی کے مقابلے میں اپنے ائمہ کی حکمت عملی کا تجزیہ کریں۔

ائمہ عصمتؑ کے درمیان جن حالات سے امام رضاؑ دوچار رہے، وہ انتہائی قابل غور ہیں۔ کیونکہ ایک طرف ''مکر' باطل علمبردار ہے اور دوسری طرف ''مکاری کے جواب'' کا رہبر برحق۔

مامون کی چال

مامون امام رضاؑ کو جو ''اقدار اسلامی'' کے علمبردار ہیں اپنا ولی عہد کیوں نامزد کرتا ہے اور یہ حکم جاری کرتا ہے کہ خلافت عباسیہ کے زیر نگین تمام قلمرو میں واعظین امام رضاؑ کے نام کا خطبہ پڑھا کریں؟ مامون امام رضاؑ کو کیوں مدینہ سے بلوا کر اپنی ولیعہدی کی پیش کش کرتا ہے اور کیوں انہیں سخت مجبور کرتا ہے کہ وہ اسے قبول کرلیں؟

پہلا نکتہ جو ہم اس اقدام سے سمجھ سکتے ہیں، وہ امامؑ کے اثرات اور ان کے سماجی سیاسی کردار کی اہمیت ہے، کیونکہ مامون، جو دنیا میں سب سے بڑا صاحب اقتدار بادشاہ تھا، جب تک امامؑ کے

سیاسی سماجی اور جنگی توانائی کے وزن کو سمجھ نہ لیتا، امامؑ کے آگے، جن کو وہ اپنے نظام کا دشمن سمجھتا تھا، ہتھیار نہیں ڈال سکتا تھا۔ ناممکن تھا کہ مامون ایک گوشہ نشین شخص کو، جو سیاست سے بے تعلق تنہا مدینہ کی گلی کے ایک گھر کے کسی گوشہ میں یا مسجد نبوی میں وعظ یا روحانی و معنوی فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو، مدینہ سے پایۂ تخت میں بلوائے اور اسے اپنے نظام خلافت کا دشمن سمجھتے ہوئے بھی اس کے آگے ہتھیار ڈال دے۔ ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اس عمل سے مامون کی نیت کیا تھی؟

اس زمانے کے سرکاری مورخوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مامون کا یہ فعل حق پرستی اور انصاف کا نتیجہ تھا۔ مثلاً طبری لکھتا ہے کہ 'امام رضاؑ کی ولیعہدی کے اعلان سے مامون کا منشا یہ تھا کہ: اِنَّهُ نَظَرَ فِيْ بَنِي الْعَبَّاسِ وَبَنِي عَلِي فَلَمْ يَجِدْ اَحَداً هُوَ اَفْضَلُ وَلَا اَوْرَعُ وَلَا اَعْلَمُ مِنْهُ۔ (مامون نے دیکھا کہ بنی عباس اور اولاد علیؑ میں امام رضاؑ سے بڑھ کر متقی اور صاحب علم کوئی نہیں ہے۔[۱]) یعقوبی اور ابن اثیر اسی نظریہ کو دوہراتے ہیں۔[۲]

اصفہانی بھی یہی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مامون صدق نیت سے عہدۂ خلافت امام رضاؑ کے نام منتقل کرنا چاہتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں، مامون کے ساتھ امین کی خوں آشام جنگ کے دوران مامون نے عہد کیا تھا کہ اگر وہ فتحیاب ہوجائے گا تو خلافت کو اولاد علیؑ کی افضل ترین فرد کے نام منتقل کردے گا۔ چونکہ امام رضاؑ سب سے افضل تھے، اس لئے مامون نے خلافت ان کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی۔[۳]

فخری بھی مورّخین کے اسی گروہ سے تعلق رکھتا ہے جو مامون کے اس فیصلہ کو صدق نیت پر محمول کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

اِنَّ الْمَأْمُوْنَ فَكَّرَ فِيْ حَالِ الْخِلَافَةِ بَعْدَهُ وَاَرَادَ اَنْ يَجْعَلَهَا فِيْ رَجُلٍ يَصْلُحُ بِهَا لِقِيرَ ائِ ذِمَّتِهِ كَذَا زَعَمَ۔[۴]

مگر حقیقت یہ ہے کہ مجموعی مقاصد اور عمومی مفادات کے لحاظ سے مامون میں اور دیگر خلفاء میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ ہوس کا بندہ اور صاحب قوت و ثروت تھا اور اس کا آخری مقصد ذاتی اقتدار کا استحکام تھا اور اس معاملہ میں اس نے اپنے بھائی کے قتل سے بھی گریز نہ کیا۔

امام رضاؑ کو اپنا ولیعہد اور خلیفہ نامزد کرنا بھی، اپنے اقتدار کے استحکام اور اپنے دشمنوں کو کمزور کرنے کی ایک تدبیر تھی۔ شیعہ مفکرین نے ہمیشہ اس بات کو ماننے سے انکار کیا ہے کہ مامون کا یہ فیصلہ صدق نیت پر مبنی تھا اور یہ واضح کیا ہے کہ مامون کا یہ اقدام صرف سیاسی مصلحت کی بنیاد پر تھا۔(۵) مورخین کا وہ گروہ جو مامون کے اس فیصلہ کو ایک صادقانہ فیصلہ بتاتا ہے، ان کا مقصد مامون کو انصاف پسند اور حق دوست ظاہر کرنا ہے۔ ان کی کوشش مامون ہی کے منصوبے اور اسٹریٹجی کا حصہ ہے۔ مقاصد کے اعتبار سے مامون اور دیگر خلفا میں کوئی فرق نہ تھا۔ سب اقتدار کے دیوانے تھے۔ مگر دو باتوں میں وہ اپنے خلفائے سلف وخلف سے مختلف تھا۔

اولاً یہ کہ مامون دوسرے تمام خلفاء کے مقابلے میں بہت زیادہ چالاک تھا، اور اس لحاظ سے اسے عباسی معاویہ کہا جاسکتا ہے۔ جس طرح امیر معاویہ نے حکومت کے لئے طاقت کو سفارت کاری (Diplomacy) سے ملا دیا تھا، اسی طرح مامون بھی طاقت کے ساتھ سیاست کو استعمال کرنے کے فن میں ماہر تھا۔ وہ کہیں زیادہ چالاک تھا کہ طاقت کو اقتدار کے استحکام کا واحد ذریعہ سمجھتا، بلکہ ڈپلومیسی، سیاست اور اچھوتا سیاسی تدبر (Tactics) اپنانے کی طرف بھی اس کا رخ تھا۔ اسی طریقے سے اس نے عرب عمائدین اور عباسیوں کی مخالفت اور امین کا چھوٹا بھائی ہونے کے باوجود، امین کو راستے سے ہٹا دیا اور خود خلافت پر قبضہ کرلیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مامون دوسرے اموی اور عباسی خلفاء کے مقابلے میں نسبتاً اچھا علمی فکری اور ثقافتی ذوق رکھتا تھا اور اپنا ظاہر ایسا بنائے رکھتا تھا۔ گویا وہ علم وفضیلت کا دوستدار اور حق وانصاف کا طرف دار ہے۔ صاحب فخری اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کَانَ الْمَأْمُوْنُ مِنْ اَفَاضِلِ خُلَفَائِهِمْ ------ وَكَانَ فَطَنَاً شَدِيْداً۔"(۶) (یعنی "مامون دوسرے عباسی خلفا سے زیادہ چالاک تھا۔)

سیوطی کہتے ہیں: "کَانَ اَفْضَلُ رجال بَنِی الْعَبَّاسِ حَزماً ------------ وَعِلْماً وَزَھْباً۔"(۷)

مامون کی چالاکی، علم اور سیاست یہ وہ دو اہم باتیں تھیں جو حکومت میں اس کی قوت اور فریب

کی آمیزش کا سبب بنیں۔

مامون کا مقصد

'طاقت' کو 'اقتدار' میں اور 'سرکاری فرمان' کو 'شرعی قانون' میں بدلنا

مامون جو دوسرے خلفاء کے مقابلے میں زیادہ چالاک تھا یہ نکتہ سمجھ چکا تھا کہ 'طاقت' 'اقتدار' اور "حکومت" اور "شرعی حیثیت" میں کیا فرق ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر "حکومت" عوام کی نظروں میں 'شرعی حیثیت' سے محروم ہو تو ہمیشہ متزلزل اور خطرات میں گھری رہتی ہے۔

عباسیوں نے امویوں سے جنگ کے دوران اپنی تحریک کی 'شرعی حیثیت' کو پیغمبرؐ وآل پیغمبرؐ سے انتساب کے ذریعے حاصل کیا تھا اور امام حسینؑ کے انتقام کے نام پر اپنی اموی مخالف تحریک کو آگے بڑھایا تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ کامیابی کی صورت میں وہ اقتدار کو اصل حق دار یعنی آل محمدؐ کے سپرد کردیں گے، مگر اموی حکومت کے زوال کے بعد عنانِ حکومت خود ہی سنبھال لی اور پچھلے نعرے بھول گئے۔ اسی وجہ سے عراق، خراسان اور فارس کے عوام کی نگاہوں میں جو آل محمدؐ اور ائمہ اہلبیتؑ کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے، ان کو قانونی حیثیت حاصل نہ تھی اور امویوں کی طرح شمار کئے جانے لگے۔

مامون کی غالباً یہ خواہش تھی کہ امام رضاؑ کی ولی عہدی کا جال پھیلا کر "طاقت" کو "اقتدار" میں تبدیل کرے اور "حاکمیت" کو عوام کی نظر میں "جائز" بنادے۔ وہ امام رضاؑ کو اپنے سماجی اور سیاسی نظام کی توجیہ کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ لیکن امامت نے اپنے نپے تلے اور ربانی عمل اور حکمت کے ذریعہ اس طاغوتی منصوبہ پر پانی پھیر دیا اور ولی عہدی کو توجیہ نظام کا وسیلہ بننے کے بجائے اسی نظام کو کچل ڈالنے کے اسلحے میں تبدیل کردیا۔

دوسرا مقصد عوام کی نظروں میں حکومت کی 'ساکھ' کو بدلنا

مامون اپنے اس اقدام کے ذریعے عوام کی نظر میں خلافتی نظام کی ساکھ کو بدلنا چاہتا تھا۔ امویوں کے دور سے خصوصاً یزید کے زمانے سے حکومت میں ایک عجیب وحشی پن، درندگی (بربریت)،

اور تمدن کُشی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ عباسیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد سفاح، منصور اور ہارون کی خون آشامیاں اور درندگی اس کیفیت کے باقی رہنے کا باعث ہوئی۔ اس پر امین و مامون کی خانہ جنگی نے اس 'ساکھ' کو بدلنے میں کوئی مدد نہ کی۔

مامون چونکہ چالاکی کے لحاظ سے تمام سابق خلفاء سے مختلف تھا، اس لئے وہ حکومت کے بارے میں اس عام تاثر کو بدل دینا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے ایک طرف تو اس نے خود کو علم دوست ظاہر کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف خود کو حق و فضیلت کا طرف دار ثابت کرنا چاہا۔ چنانچہ اپنے پہلے مقصد کو پورا کرنے کی خاطر اس نے قدیم علمی مآخذ کی اشاعت، اور حکماء اور فلسفیوں کی کتابوں کے ترجموں، علمی مناظروں اور فلسفیانہ نشستوں کا سلسلہ شروع کیا اور دوسرے مقصد کی تکمیل کے لئے اہلبیتؑ کے فضائل کا اقرار خصوصاً امیر المومنینؑ کے مرتبہ کا اعتراف، سادات کا احترام اور امام رضاؑ کی ولی عہدی کا اعلان کیا تا کہ اسے حق پسند سمجھا جانے لگے۔ یہ دونوں اقدام مامون کی ایک ہی پالیسی کے دو پہلو ہیں جن کا مقصد حکومت کے لئے شرعی حیثیت عوامی اور مقبولیت پیدا کرنا اور حکومتی نظام کی ساکھ کو بدلنا تھا۔

تیسرا مقصد ابھرتی ہوئی شیعہ تحریک کو دبانا

اس دور میں شیعیت ایک عوامی انقلابی قوت کی صورت میں ابھر آئی تھی اور شیعہ، نظامِ حاکم کے خلاف حزب مخالف کی شکل میں ابھر رہے تھے۔ دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں بالخصوص خراسان میں انقلاب کا آتش فشاں تیار تھا اور لاوا پھوٹنے ہی والا تھا۔ مامون امام رضاؑ کی ولی عہدی کے اعلان سے اس آتش فشاں کو سرد کرنا چاہتا تھا، لاوے کو پھوٹنے سے روکنا چاہتا تھا، انقلابیوں کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو ٹھنڈا کرنا اور تحریک میں پھوٹ ڈالنا چاہتا تھا اور تحریک کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مگر امام رضاؑ کی حکمت عملی نے تحریک کو اور زیادہ پھیلا دیا۔

شیعہ عربی مصنف ہاشم معروف اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور لکھتا ہے کہ: ''جب مامون نے دیکھا کہ شیعہ اثرات پھیلتے چلے جا رہے ہیں، یہاں تک کہ اس کے ارکانِ دولت میں

بھی شیعہ ائمہ اور شیعیت کی طرف جھکاؤ پایا جانے لگا ہے، تو اس نے اس کا سدِّباب کرنا چاہا۔ چنانچہ امام رضاؑ کی ولیعہدی کا اعلان شیعہ تحریک کو پھیلنے سے روکنے کی ایک چال تھی۔ ایک طرف وہ تحریک کی آگ کے سرد ہونے کا منتظر تھا، دوسری طرف انقلابیوں کے رہبر کو پایۂ تخت میں اپنے آدمیوں کی نگرانی میں رکھنا چاہتا تھا۔''(۸)

۱۳۲ھ سے یعنی جب سے عباسی برسرِ اقتدار آئے، مختلف شیعی انقلابات کا ایک تسلسل سا قائم ہوگیا، یہاں تک کہ بعض وزراء بھی شیعی رجحانات رکھتے تھے اور خلافت کو بنی فاطمہ کی طرف منتقل کر دینا چاہتے تھے۔ (ابی سلمہ الخلال نے ابی عباس سفاح کے دور میں اور یعقوب بن داؤد نے المہدی کے دور میں ایسی ہی جدوجہد کی۔) امین اور مامون کے دور میں بھی بڑی بڑی شیعہ تحریکیں ہوئیں۔ محمد بن ابراہیم اور ابی السرایا کے انقلابات یا محمد دیباج بن امام جعفر صادقؑ کا قیام ایسا ہی ہے۔ دراصل شیعہ تحریکیں اور انقلابات مامون کی حکومت کے ابتدائی دنوں میں اپنے عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اس دور میں ہر دور سے زیادہ شیعوں کی جدوجہد وسیع اور انقلاب کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ مامون کے لشکر کا سپہ سالار طاہر بن حسن خود شیعی خیالات کا حامل تھا۔

امام رضاؑ کی ولی عہدی سے مامون یہ چاہتا تھا کہ اس بہانے سے شیعوں کو جنھوں نے ایک حزب مخالف کی شکل میں مقابلہ کا نقشہ بنا رکھا ہے ان کو مورچوں سے باہر کھینچ کر (اس) مقابلہ کا خاتمہ کر دے۔ وہ چاہتا تھا کہ امامؑ کے انقلابی مقام و منزلت پر کاری ضرب لگائے اور شیعوں کی امکانی (Potential) انقلابی طاقت کو دبا دے۔ اس زمانے تک شیعہ ہمیشہ ایک مخالف قوت اور محاذی عنصر سمجھے جاتے تھے جو پہاڑوں اور درّوں میں مورچہ بندی کرتے تھے۔ مامون امام رضاؑ کو ولیعہدی قبول کرنے پر اس لئے مجبور کر رہا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیعہ مقابلہ پر ایک ضرب لگائے جس نے حکومت سے پل بھر کا چین بھی چھین لیا تھا۔ مگر امام رضاؑ نے اپنی رہبری کی خداداد استعداد کی بنا پر اس کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا اور اس موقع سے فائدہ

اٹھا کر تحریک کو اور پھیلا دیا حتیٰ کہ مامون امامؑ کو شہید کر دینے پر بزعم خود مجبور ہو گیا۔

چوتھا مقصد امامؑ کی شخصیت کو توڑنا

حکومت کا مقصد امامؑ کے انقلابی شخصیت پر ضرب لگانا تھا۔ امامؑ کی شخصیت کو کمزور کرنے کے لئے مامون نے دوسرے طریقے اور تدبیریں بھی آزمائیں مثلاً علم کلام کے چنندہ تجربہ کار ماہروں کے ساتھ امامؑ کے مناظرے کرانا تاکہ امامؑ کبھی شکست کھا جائیں اور ان کی علمی وقعت مجروح ہو جائے، لیکن ہر مناظرہ میں امامؑ کی شخصیت اور بھی زیادہ آب و تاب کے ساتھ سامنے آئی۔

پانچواں مقصد

داخلی دشمنوں کے خلاف اقتدار کی جنگ میں شیعہ طاقت کا استعمال

یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ امام رضاؑ کی ولیعہدی کے اعلان سے مامون ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف شیعوں کے انقلابی رجحانات کو قابو میں رکھنا اور دوسری طرف اس عظیم قوت کو اپنے مفاد میں استعمال کرنا۔ ابھی تک مامون کے اقتدار کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں اور عرب عمائدین مامون کے مقابلے میں امین کے طرفدار تھے اور مامون اقتدار کے مرکز کو عرب عمائدین کی طرف سے بدل کر اہل خراسان کی طرف کر دینے کی کوشش میں تھا۔ اہلبیتؑ سے ظاہری دوستی محض اس خیال سے تھی کہ شاید اس طرح ایرانی عوام اس کے حامی ہو جائیں۔ امام رضاؑ کی ولی عہدی کے اعلان سے انقلابی شیعوں کی عظیم قوت کو وہ اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اور اہل خراسان کی حمایت بھی حاصل کرنا چاہتا تھا جو زیادہ تر شیعی رجحانات رکھتے تھے اور جن کی مدد سے اپنے داخلی دشمنوں کو شکست دے سکا تھا۔ عرب کے عوام چونکہ امین کے طرفدار تھے لہٰذا اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ فارس اور خراسان کے عوام پر بھروسہ کرے۔

چھٹا مقصد خراسان کے عوام کی خوشنودی حاصل کرنا

امام رضاؑ کی ولیعہدی کے اعلان سے مامون کا ایک اور مقصد خراسان والوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا، یہاں تک کہ امین کی شکست کے بعد بھی وہ اپنے اقتدار کی حفاظت کے سلسلے میں

خراسان والوں ہی پر بھروسہ کرتا تھا۔ اس کی ماں جس کا نام مراجل تھا خود بھی خراسان ہی کی رہنے والی تھی۔ امین اور مامون کی خونی خانہ جنگی درحقیقت عرب اور فارس و خراسان والوں کے بیچ کھینچا تانی تھی۔ مامون کا وزیر فضل بن سہل ایرانی تھا اور امین کا وزیر فضل بن ربیع عرب تھا۔ اقتدار بچانے کے لئے مجبوراً مامون زیادہ تر ایرانیوں اور خراسانیوں پر بھروسا کرتا تھا۔ (۹) چوں کہ اکثر خراسانی شیعی رجحانات رکھتے تھے، اس وجہ سے ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے مامون مجبوراً خود کو اہلبیتؑ کا دوست ظاہر کرتا تھا۔

شہادت امام رضاؑ مامون کی اسٹریٹجی کی ناکامی کا مظہر

امام رضاؑ کی ولیعہدی کے سلسلہ میں مامون کا اقدام، عباسی نمک خوار مورخین کے نظریے کے برخلاف، مخلصانہ نہ تھا بلکہ یہ اقدام قطعی سیاسی اور ریاکارانہ تھا، مگر امامؑ نے خداداد حکمت عملی کے ذریعہ مامون کے نقشہ کو نقش برآب بنا دیا۔

امامؑ نے مختلف طریقے اور اظہار کراہت کے ذریعہ مامون کو اس کے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا بلکہ ولیعہدی کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام کے سچے پیغام، شیعیت کی تبلیغ، حکومت اور موجودہ نظام کو پابند بنانے کا کام کیا۔ امامؑ کے اسی عظیم کارنامے نے مامون اور حکومت کو اس درجہ خوفزدہ کر دیا کہ بالآخر گھبراہٹ کے عالم میں مامون نے انہیں زہر دلوا کر شہید کروا دیا۔

امام رضاؑ کی شہادت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی حکمت عملی کے مقابلے میں مامون کی چال مات کھا گئی۔ خلیفہ نے امامؑ کو زہر دے کر اپنی کمزوری اور بے چارگی کا اعتراف کیا ہے۔ مَکَرُوْا وَمَکَرَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی

مامون اور اس کی خلافت کی اسٹریٹجی کے مقابلے میں امامؑ کی حکمت عملی کیا تھی؟ امام رضاؑ کی حکمت عملی بالکل نئی، بے حد حساس اور بہت زیادہ قابل غور ہے حکمت عملی پوری طرح تازہ اور نئی ہے، اس لئے کہ اس سے پہلے شیعہ ائمہ مقابلہ کو بڑھانے کی غرض سے ہمیشہ دارالخلافہ سے دور رہتے

تھے مگر امام رضاؑ نے مجبوراً ولیعہدی قبول کی اور دارالخلافہ میں رہ کر مقابلہ کو آگے بڑھایا۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی بے حد حساس ہے، اس لئے کہ انقلابی ساکھ کو برقرار رکھنے کے لئے دارالخلافہ سے دور رہنا، ولی عہدی قبول کر لینے سے زیادہ آسان تھا، لیکن امام رضاؑ نے تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے ولی عہدی کو ذریعہ اور وسیلہ کے طور پر استعمال کیا۔

یہ حکمت عملی بے حد قابل توجہ ہے کیوں کہ حق و باطل کی کشمکش میں طرح طرح کی تدبیریں اور مختلف طریقہ کار استعمال ہوا کرتے ہیں۔ کبھی 'قعود' یعنی بیٹھنے (صلح) حسنؑ اور کبھی قیام یعنی اٹھنے (جہاد حسینی) نبرد آزمائی کی گئی، کبھی (خطابت) حضرت زینبؑ سے کام لیا گیا، کبھی دعا (سید سجادؑ) اور کبھی نشر علوم اور نظریاتی کام (امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ) کبھی قید و بند (امام موسیٰ کاظمؑ) اور کبھی مسند ولی عہدی (امام علی رضاؑ) کے ذریعہ تحریک کے سچے رہبروں نے مقابلہ کیا۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی اس وجہ سے بھی بے حد قابل غور ہے کہ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک خدائی رہبر کس طرح بدترین حالات میں اپنی خواہش کے خلاف جبریہ ولی عہدی قبول کر کے بوجوہِ احسن اس ولی عہدی سے تحریک کے لئے فائدہ حاصل کرتا ہے۔

امام رضاؑ نے اس قسم کی حکمت عملی کا انتخاب کیوں کیا؟ اسے سمجھنے کے لئے ہمیں اس زمانے کے اسلامی معاشرے کا جائزہ لینا چاہئے۔ پیغمبر اسلامؐ کے بعد ''معیار''، ''مقدار'' پر قربان ہو چکا تھا۔ اسلام تیزی کے ساتھ ایشیا، افریقہ اور یوروپ میں پھیل چکا تھا۔ لاکھوں لاکھ افراد مسلمان ہو گئے تھے مگر ان میں زیادتی ایسے افراد کی تھی جو نام کے لئے تو مسلمان ضرور ہو گئے تھے مگر عملاً وہ دور جاہلیت کے عقائد اور تہذیب کے پابند تھے۔ اگر کسی حد تک اسلام سے آشنا بھی تھے تو یہ وہ اسلام تھا جو انہیں دربار خلافت سے ملا تھا۔ حجاز، کوفہ، بصرہ اور یمن کے عوام یعنی دنیائے اسلام کے مرکز کے لوگ کسی حد تک اسلام سے واقفیت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے شیعی تحریکوں کی ابتدا ان ہی علاقوں سے ہوئی تھی۔ مگر ترکستان، ماوراء النہر، روم، افریقہ، یورپ (اندلس) اور سندھ وغیرہ کے عوام اسلام کی صحیح تعلیمات، ائمہ کی منزلت اور شیعی تحریک سے تقریباً بے بہرہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر خلفائے عباسیہ نے شیعہ تحریک کو تاتاریوں، ترکوں اور رومیوں کی مدد سے کچلا ہے۔

نسبتاً منصف اور ذمہ دار دانشور جو قلب دنیائے اسلام کے مرکزی خطہ (حجاز، بغداد، دمشق) کے رہنے والے تھے حکومت کے مخالف تھے، اور ائمہ اہلبیتؑ کی طرف رجحان رکھتے تھے (یہاں تک کہ ائمہ اہلسنت یعنی ابوحنیفہ، شافعی اور مالک نے بھی حکومت کے کارندوں کے ہاتھوں دُرّے کھائے اور قید کی سختیاں جھیلیں)۔ حکومت کے پالے ہوئے 'سرکاری' علماء کا کام موجودہ نظام حکومت کی توجیہ پیش کرنا تھا۔ جو اسلام ترکستان اور تفقاز کے لوگوں تک پہنچا تھا وہ فیلتو رانیوں کے ذریعہ پہنچا تھا۔

واقف کار علماء اور عوام تو ائمہ کو روحانی اور حقیقی پیشوا کی حیثیت سے سمجھتے تھے جب کہ حکومت کو غیر شرعی سمجھتے تھے لیکن ناواقف اور دور دراز علاقوں میں بسنے والے افراد حکومت کی قدغن اور غلط پروپیگنڈہ کی وجہ سے ائمہ کی معرفت نہیں رکھتے تھے۔ صرف حجاز، مدینہ اور کچھ عراق و ایران کے محدود علاقوں میں پیغمبرؐ اور اہلبیتؑ کی یاد دلوں میں باقی رہ گئی تھی۔ علماء کے درمیان امام محمد باقرؑ اور امام صادقؑ کا ذکر نمایاں طور پر ہوتا تھا۔ بقیہ عوام یعنی بلخ سے لے کر اندلس تک کے رہنے والے حکومت کی افواہوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے اس حقیقت سے لاعلم تھے کہ رسولؐ کے گھرانے پر کیا گذر رہی ہے۔ خصوصاً امام موسیٰ کاظمؑ کے زمانے میں جو خلیفہ کی قید میں تھے، رسولؐ کے گھرانے اور تشیع کے اور عوام کے درمیان رابطہ بہت دشوار ہو گیا تھا۔

ان ہی حالات میں امام رضاؑ نے امامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں اور مامون نے ان پر ولیعہدی لاد دی۔ اور انھیں اسے قبول کرنے پر مجبور کیا۔ ایسی حالت میں اگر حکومت کے جبر و تشدد کے باوجود امامؑ یہ تہیہ کر لیتے کہ وہ اس پیش کش کو ٹھکرا دیں گے تو زیادہ سے زیادہ وہ شہید ہو جاتے جو علیؑ اور حسینؑ کے وارثوں کے لئے افتخار کی بات تھی اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا، تاہم بادل ناخواستہ اس پیش کش کو منظور کر لیا تا کہ اسی ذریعہ سے اماموں کے نام اور شیعیت کا پیغام عالم اسلام کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں۔ امامؑ چاہتے تھے کہ حکومت کی ضرورت کو 'برج فریاد' کے طور پر تشیع کی نقابت کا ذریعہ بنا لیں اور اسی مقام سے شیعیت کی آواز دنیا کے کانوں تک پہنچا دیں۔

امام حسینؑ نے اپنے خون، حضرت زینبؑ نے اپنی خطابت اور سید سجادؑ نے اپنی دعاؤں سے

شیعی تحریک کو اس حد تک محکم بنا دیا تھا کہ اب اس کے وجود کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا اور امام محمد باقرؑ اور امام جعفرؑ صادق نے شیعہ علوم کو مسلک کی شکل میں مدوّن کر دیا تھا۔ اس وجہ سے ولی عہدی کی پیش کش کو قبول کر لینے سے شیعہ مسلک کی غلط تفسیر کا کوئی احتمال باقی نہ رہا۔ چنانچہ امام رضاؑ نے اپنے اس عمل کے ذریعہ اس تحریک کو پھیلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

امام رضاؑ کی ولی عہدی کی بناء پر پہلی بار عالم اسلام کے تمام مساجد میں ایک خدائی رہبر اور امام اہلبیتؑ کا پیغام خطبہ میں شامل ہوا اور پہلی مرتبہ دنیائے اسلام کے سرحدی علاقوں میں رہنے والوں کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ پیغمبرؐ کے خاندان کی ممتاز ہستیاں ابھی موجود ہیں اور اس درجہ فضیلت کی مالک ہیں کہ خلیفہ تک انہیں عالم اسلام کی رہبری کے لئے لائق ترین فرد مان لینے پر مجبور ہے۔ امام رضاؑ نے شیعیت کو رسمی حکومت کے مقابلے میں ایک عظیم سیاسی قوت کی شکل بخشی۔ امام رضاؑ کے لئے ولی عہدی اپنے پیغام کی نشر و اشاعت کا اور دنیا کے کانوں تک حق کی آواز پہنچانے کا ایک ذریعہ تھی۔

مامون نے خود کو امامؑ کا طرفدار ظاہر کرنے کے لئے احکامات جاری کر دیئے کہ تمام مملکت اسلامی کی مساجد میں جمعہ کے خطبہ میں امامؑ کا نام شامل کیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے حکومت کا قومی رنگ سیاہ کے بجائے سبز قرار دے دیا، کیوں کہ سیاہ رنگ بنی عباس کا قومی نشان تھا اور سبز رنگ بنی فاطمہ کا۔ جہشیاری لکھتا ہے:

"وَ کَانَ الْمَأْمُوْنُ قَدْ جَدَّ فِی تَجْدِیْدِ الْعَهْدِ لِعَلِی الرِّضَاؑ وَیَقُوْمُ اِلَی الْفَضْلِ بِاَخْذِ الْبَیْعَةِ عَلَی النَّاسِ وَ الْکِتَابَةِ اِلَی الْاَقَالِیْمِ فِی اَبْطَالِ السَّوَادِ وَ کَتَبَ الْفَضْلُ اِلَی اَخِیْهِ الْحَسَنِ تَعْلِیْمِهِ بِذٰلِکَ وَیَأْمُرُهُ بِتَرْکِ السَّوَادِ وَ اَنْ یَلْبَسَ الْخَضْرَةَ وَیَجْعَلَ الْاَعْلَامَ وَ الْقَلَانِسَ الْخَضْرَاءَ وَیُطَالِبُ النَّاسَ بِذٰلِکَ وَ کَاتَبَ فِیْهِ جَمِیْعَ عُمَّالِهٖ۔"

اس طرح امامؑ کے نام اور شیعی تحریک کے پیغام کی توسیع ہوئی۔ جس ہتھیار کو مامون نے امامؑ کے خلاف اور شیعی تحریک کو بیکار کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہا تھا، امامؑ نے اسی ہتھیار کو خلافت اور حکومت کے خلاف استعمال کیا اور مجبوری کے باعث جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان ہی حالات

سے امامؑ نے شیعی تحریک کے مفاد میں استعمال کیا۔

امام رضاؑ کی حکمت عملی یہ تھی کہ ایک طرف تو ولی عہدی قبول کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ خلافت کو وہ اپنا حق سمجھتے ہیں، اور دوسری طرف بار بار مختلف طریقوں سے اس بات کو ظاہر کیا کہ مامون اور اس کی حکومت کے مخالف ہیں اور وہ ولی عہدی کو مجبوراً قبول کر رہے ہیں۔ امام رضاؑ اسی قسم کے حالات سے گذر رہے تھے جن سے تیسرے خلیفہ کے قتل کے بعد حضرت علیؑ گذرے تھے۔ حضرت علیؑ نے بھی خلافت قبول کر لی تھی تا کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اگر علیؑ خلافت کو اپنا حق سمجھتے تھے تو انہوں نے خلافت قبول کیوں نہ کی؟ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ مجبوراً خلافت قبول کر رہے ہیں۔

امام رضاؑ جانتے تھے کہ ان کا ولی عہد بننا مامون کی توقعات کے خلاف ثابت ہوگا اور ان کی ولی عہدی سے شیعی تحریک ختم نہیں ہوگی کیوں کہ شیعہ وہ مومن ہیں جو امامؑ کی عصمت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ امامؑ کبھی حکومت کے آلہ کار نہیں بنیں گے اور ولی عہدی کو قبول کرنے کا مقصد، نظام خلافت کو باطل قرار دینا ہے۔ امام رضاؑ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ وہ مامون کو یہاں تک ہراساں کر دیں گے کہ وہ انہیں شہید کرا دے۔ اس طرح ولی عہدی کا قبول کرنا حکومت اور شیعوں کے درمیان مخالفت بڑھانے کا سبب ہو جائے گا، نہ کہ کم کرنے کا۔

امام رضاؑ نے اپنی حکمت عملی سے مامون کی حکمت عملی کو شکست دے دی اور ولی عہدی کو ایک ایسا 'منبر' بنایا جہاں سے وہ شیعی احتجاج کو عالم اسلام کے گوشے گوشے تک پہنچا سکیں۔

ہم امام رضاؑ کی غیر معمولی حکمت عملی کی کامیابی کو اس ردّ عمل سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے بعد مملکت اسلامی کے طول و عرض میں مختلف شیعہ انقلابی تحریکیں ابھرنے لگیں اور حکومت اس قدر ہراساں ہوگئی کہ بعد کے ائمہ کو ہمیشہ یا تو قید میں رکھا گیا یا کڑی نگرانی میں رکھا اور متوکل جیسے لوگوں نے دجلہ و فرات کو بے شمار شیعوں کے خون سے رنگین کر دیا۔

جس طرح امام حسنؑ کی حکمت عملی نے حکومت کے کریہہ چہرہ سے منافقت کی نقاب نوچ پھینکی اور 'معاویہ' 'یزید' میں تبدیل ہو گیا۔ اسی طرح امام رضاؑ نے بھی منافق حکومت کے چہرے سے اسلام دوستی کا نقاب نوچ پھینکا تھا اور مامون کو متوکل کے روپ میں اپنا اصلی چہرہ دکھانے پر مجبور

کردیا تھا کیوں کہ حق اور حق پرستوں کے لئے ''معاویہ'' اور ''مامون'' کا مرحلہ ہمیشہ ''یزید'' اور ''متوکل'' کے مرحلہ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

(۱) طبع، ج۷ ص۱۳۵ (۲) ملاحظہ ہو: ابن اثیر، الکامل، ج/۱، ص/۱۱۱، یعقوبی، ج/۳، ص/۱۷۶ (۳) مقاتل الطالبین (۴) الفخری، ص۱۹۸ (۵) مثال کے لئے دیکھیں: رضا المظفر: تاریخ الشیعہ معروف بہ عقیدۃ الشیعہ الامامیہ، ص۱۶۱ علامہ طباطبائی: شیعہ دراسلام وعلامہ سید علی نقی: زندگانی اماماں (رہنمایان اسلام) حصہ ۸ (پاکستان ایڈیشن) (۶) الفخری، ص۱۹۸ (۷) تاریخ الخلفاء، ص۳۰۶ (۸) سید ہاشم معروف، عقیدۃ الشیعہ الامامیہ، ص۱۶۱ (۹) طبری، ج۷ ص۱۵۹ / ابن اثیر الکامل، ج۶ ص۱۰۱

منقبت حضرت امام علی ابنِ موسیٰ الرضا علیہ السلام

حضرت احمد جامع شیخ الاسلام ژندۂ پیل رحمۃ اللہ علیہ

توزِ نور مصطفائیؐ یا علی موسیٰ علیہ السلام رضا
نورِ چشم مرتضا علیہ السلامئی یا علی موسیٰ علیہ السلام رضا
بابِ تو شیر خدا و اُمّ تو فخر النسا
جدِّ تو سلطانِ دین است یا علی موسیٰ علیہ السلام رضاؑ
من بگویم نامِ تو تا تازه گردد جانِ من
ہر زمان از شوق گویم یا علی موسیٰ علیہ السلام رضا
میوۀ جانِ موالی آفتاب نیم روز
چتر دارِ روزِ محشر یا علی علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام رضا
ہر که در مشہد در آید حاجتی خواہد زِ تو
حاجتش را حق بر آرد یا علی موسیٰ علیہ السلام رضا
آن امامی تو که کردند در خراسانی شہید
تو امامِ ہشتمین ہست یا علی موسیٰ رضا
زہر دادند آن چگونه از عنب دادند زهر
چون شہید کربلای یا علی موسیٰ علیہ السلام رضا

انس و جن ووحش وطیر و ماہی اندر زیر آب
می سرایند ہر سحر گہ یا علی موسیٰ علیہ السلام رضا

من غلامِ قنبرم، قنبر غلام حیدر علیہ السلام ست
من غلامت را غلامم یا علی موسیٰ علیہ السلام رضا

دیدنِ پاک ترا کردن زیارت بی گمان
ہفت حج اکبر آمد یا علی موسیٰ علیہ السلام رضا

احمدِ جامی کہ گوید روز و شب مدحِ رسول ص
در قیامت چتر گردان یا علی موسیٰ علیہ السلام رضا

-

حوالہ: دیوان حضرت احمد جام زندہ پیل شمارۂ کتاب ۴۵۱ صفحہ ۳ مخطوطات کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن۔

منقبت حضرت امام علی ابنِ موسیٰ الرضا علیہ السلام

حضرت نورالدین ملّا عبدالرحمٰن جامیؔ رحمۃ اللہ علیہ

سَلامٌ علیٰ آلِ طٰہٰ و یٰسین
سَلامٌ علیٰ آلِ خیر النبیّین
سَلامٌ علیٰ روضۂ جلّ فیہا
امامی پناہی بہ الملک والدین
امامی بہ حق شاہِ مطلق کہ آمد
حریمِ درش قبلہ گاہِ سلاطین
شہ کاخِ عرفان، گل شاخِ احسان
دُرِ درجِ امکان، مہ برجِ تمکین
علی علیہ السلام ابنِ موسیٰ رضا علیہ السلام کز خدائش
رضا شد لقب چون رضا بودش آئین
ز فضل و شرف بینی او را جہانی
نہ بودت اگر تیرہ چشمِ جہان بین
پی عطر روبند حورانِ جنّت
غبارِ دیارش ز گیسوی مشکین
چو جامیؔ چشد لذت تیغ مہرش
چہ غم گر مخالف کشد خنجر کین

-

حوالہ: سالار جنگ میوزیم لائبریری، ادب نظم فارسی قلمی ریکارڈ شمارہ کتاب ۲۷۷ دیوان حضرت جامی۔

منقبت شاہ خراسان حضرت امام علی رضا علیہ السلام

حضرت مولانا شاہ محمد ابوالحسن پھلواری شریف متخلص بہ فردؔ رحمۃ اللہ علیہ

صبا گر بار می یابی به آن درگاهِ سلطانم
ز سوی من به کن پابوسِ سلطانِ علیہ السلام خراسانم
بخاکش چشم خود می مال واز من عرض کن شاہا!
خدا را ازدرخود ناامیدانه مگر دانم
به ہربزمی که آرایم به امید قدوم تو
چو شمع محفلِ عشرت ز شب تا صبح خندانم
به عشقت تا قبا شد جامه ام بشگفته ام چون گل
که گلہا رشک می دارند از چاکِ گریبانم
ازان خاکِ درت کحل الجواہر چشم می دارم
کزین بہتر نه باشد تحفه بہرِ دیدۂ جانم
تو سلطانی منی بنده گدای آستانِ تو
غلامِ کمترینِ خواجۂ معروف دربانم
قسم از مصحفِ رخسارِ تو تابنده ات گشتم
نه می دانم بجز روی تو قرآنی که می خوانم
نه مقصود از خراسانم بود آن شہر ومردم را

خراسان گویم وباشد مراد آن کعبۂ جانم
زبانِ من بریده باد گرمن دعویٰ ای دارم
سگِ تو ہستم و پروردۂ آن ریزه ای خوانم
ز سرتاپا ز سوز ہجر تو یک آبله ہستم
بنه بر ریشِ من مرہم که وصل تُست درمانم
بزیر آسیای چرخ گشتم سوده چون دانه
مگر از بارگاہی چون تو شاہی داد بستانم
چنان از لطفِ خود بنو از شاہا فرد مسکین را
نه بینم زحمتی تا زیر این چرخِ برین مانم

حوالہ: دیوان فرد شمارہ کتاب ۱۲/۳ جلد دوم صفحہ ۴۲۷ آصفیہ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد دکن۔

مشہد رضا علیہ السلام

شاعر اہلبیتؑ سید اشتیاق حسین رضوی ساحرؔ فیض آبادی، کراچی

انقلاب دہر کا انداز کیا انداز ہے
ہر زمانے کا نیا رخ ہے نیا انداز ہے
نائب مامون عباسی ہو اور حق کا ولی
اس ولی عہدی کا بھی سب سے جدا انداز ہے
اے امام موسیٰ کاظم کے چاند اے مہر دیں
جلوہ گستر مشہد دل پر ترا انداز ہے
اک نظر میں دیکھنے والے جسے پہچان لیں
مصحف ناطق کا وہ منہ بولتا انداز ہے
از محمدؐ مصطفی تا قائم آل عباؑ
اول و آخر سبھی کا ایک سا انداز ہے
وہ علیؑ ابن محمدؐ ابن جعفرؑ آگیا
زندگی کا جس کی تسلیم و رضا انداز ہے
آٹھواں رخ ہے رسول اللہ کی تصویر کا
ہیں وہی تیور وہی نام خدا انداز ہے
جب دیا سائل کو منہ مانگا دیا چھپ کر دیا
ہاشمی غیرت کا جیتا جاگتا انداز ہے
اللہ اللہ رفعت شان امام انس و جاں
عرش کہتے ہیں جسے وہ فرش پا انداز ہے
ہم ہیں ساحرؔ اپنے آقا کے غلاموں کے غلام
ناز کے قابل ہمارے ناز کا انداز ہے

مرثیہ

در احوال امام ثامن حضرت علیِ رضا علیہ الصلوٰۃ والسلام

(بند-۱۷۰)

مصلح مزاج غزل، بانی مسالمہ مولانا سید محمد جعفر امیدؔ اجتہادی

(۱)

فکرِ ثنائے مشہدِ ذی احترام ہے
وصفِ ریاضِ روضۂ رضواں مقام ہے
ہر فرد سرو[۱] گلشنِ دارالسلام ہے
ایک ایک بیت قدر میں بیت الحرام ہے
خامہ کا رکن خانۂ کعبہ خطاب ہے
پانی نہیں دوات میں زمزم کا آب ہے

(۲)

لکھنا ہے بارگاہ فلک جاہ کا حشم
شاخ نہال طور قلم ہوئے یک[۲] قلم
آئے سیاہیٔ حجرالاسود حرم
قبہ کا اوج صفحۂ گردوں پہ ہو رقم
توصیف یوں ہو روضۂ مینو سرشت کی
دنیا میں لوگ دیکھ لیں صورت بہشت کی

(۳)

رفعت میں ارض پاک خراساں ہے آسماں
انجم کی طرح خاک کے ذرّے ہیں [۳]ضوفشاں
جادے نہیں[۴] زمین پہ اتری ہے کہکشاں
ہر نقش پا سے جلوۂ خورشید ہے عیاں
اک اک پہاڑ کہتا ہے میں کوہ طور ہوں
اُٹھ اُٹھ کے گرد کرتی ہے دعویٰ کہ نور ہوں

(۴)

یاں کی زمین عرش سے کہتی ہے بار بار
تیری تعلّیاں یہ سراسر[۵] ہیں بے مدار
بے وجہ یہ غرور ہے، بیجا یہ افتخار[۶]
زیبا ہے آج میرے لئے دعویٔ وقار
تیری بساط پر بھی کسی کا جلوس ہے؟
مجھ پر بنائے روضۂ سلطانِ طوس ہے

(۵)

کعبہ سے ہے یہ روضۂ پرنور کا خطاب
میرے سوا ہے کون زمانے میں لا جواب
ہوتا ہے بے مکیں کا مکاں خلق میں خراب
مجھ سے مقابلہ کی تجھے بھی نہیں ہے تاب
خالی مکاں کو دعویٔ خوبی فضول ہے
یہ خوابگاہ [۷]خاص وصیٔ رسولؐ ہے

(۶)

اللہ رے بارگاہ زہے جاہ و کر و فر
اونچا ہے یہ کلس کہ پہنچتی نہیں نظر
شمسہ کی ضو ہے گنبد گردوں شکوہ پر
یا کوہ طور سے کف موسیٰؑ ہے جلوہ گر
مخزن یہی ہے سرِّ خدا کے ظہور کا
تاباں کلس سے چھٹتا ہے فوارہ نور کا

(۷)

قبہ کے ارتفاع سے گردوں ہے شرمسار
مانند عرش سقفِ معلّٰی ہے نوربار
نقش و نگار پر گل فردوس ہے نثار
اک اک ستوں سے دین کے ارکاں ہیں استوار
سرحدِّ فکر و وہم[۸] سے رفعت دو چند ہے
کرسی دروں کی عرش بریں سے بلند ہے

(۸)

روشن دروں کے نور سے روشن ہیں دشت ودر
قوس قزح کی شکل ہے محراب جلوہ گر
ابروئے حور کہتے ہیں کب صاحب نظر
فوق اس کے خم کو دیتے ہیں بینا ہلال پر
جھکتا ہے چرخ دیکھ کے اس احترام کو
کعبے کے طاق دور سے خم ہیں سلام کو

(۹)

آثار راستی کا ہے دیوار پر مدار
صنعت سے پختہ کاری صانع ہے آشکار
چاروں حدوں سے قابل تعریف ہے حصار
ہیں جمع اس احاطے میں طراحیاں[۹] ہزار

(۱۰)

[۱۰]ضو دے رہے ہیں روزن و دیوار نور کے
نکلی ہے آنکھ غرفہ جنت سے حور کے

(۱۰)

دیتے ہیں جانور سر دیوار یہ صدا
دیکھے یہ اوج آ کے چھپا ہے کدھر ہما
جاکر کسی جبل پہ نشیمن کیا تو کیا
[۱۱]اقبال مند کے لئے رہنے کی ہے یہ جا

ہر صبح اٹھ کے روضۂ رضواں کی دید ہے
جو اس کلس کے سائے میں[۱۲] بیٹھے سعید ہے

(۱۱)

کیسے[۱۳] بیان ہو در دولت کا احتشام
گویا ہے باب رحمت خلاق ذوالکرام
جھکتے ہیں آستاں پہ ملک آ کے صبح و شام
جاری جہان میں ہے اسی در سے فیض عام

رتبے میں جن و انس سے ممتاز ہوگیا
چوکھٹ پہ جو جھکا وہ سرافراز ہوگیا

(۱۲)

اندر رواق پاک کے جس کا ہوا گذر
اک قدرت خدا اسے آنے لگی نظر
سب نور کے مقام ہیں دیوار و بام و در
خیرہ نگاہ ہوتی ہے دیکھے کسے بشر

دنیا میں بڑھ کے کون جگہ اس مکاں سے ہے
ظاہر صفائے باطن مومن یہاں سے ہے

(۱۳)

ہے بیچ میں ضریح مبارک جو شبکہ دار
چھن چھن کے نور اس سے نکلتا ہے بار بار
حلقے وہ ہیں کہ حور کی آنکھیں ہیں شرمسار
کڑیوں پہ اس کی موتی کی لڑیاں ہوئیں[۱۴] نثار

صناعیوں پہ صَلِّ علیٰ کے خروش ہیں
داؤد اس مقام پہ حلقہ بگوش ہیں

(۱۴)

صندوق میں بھرا ہوا ہے نور کبریا
تعویذ قبر کا ہے کہ قرآں کھلا ہوا
ایک ایک نقش، نقشِ سلیماں سے ہے سوا
تسخیر میں ملک ہیں، یہاں جن وانس کیا

خط ہے کہ لوح قبر پہ گویا کھدا ہے یہ
تسلیم کر مزار امام ہدا[۱۵] ہے یہ

(۱۵)

پیش ضریح ہیں پر جبرئیل کے چنور
رکھے ہوئے ہیں رحلوں پہ قرآں اِدھر اُدھر
سلگا ہوا ہے مجمروں میں عنبر و اگر
بوئے بہشت سے بھی ہے خوشبو زیادہ تر
نکہت بھلا کہاں یہ کسی اور پھول کی
بو ہے گلاب پاش میں جسم رسولؐ کی

(۱۶)

نمگیرہ ضریح مغرق ہے سر بسر
خورشید کی کرن ہے کہ جھالر ہے جلوہ گر
تابندگی وہ ہے کہ ٹھہرتی نہیں نظر
لودے رہے ہیں ہیرے کے ترشے ہوئے گہر
ظاہر ہیں رنگ صنعت رب جلیل کے
سایہ فگن لحد پہ ہیں پر جبرئیل کے

(۱۷)

قندیلیں نقرئی ہیں جو روضہ میں جا بجا
اُن کی صفت میں چرب زبانی ہو کیا بھلا
کس رنگ کے ہیں جالیوں میں پھول واہ وا
گویا ہے ایک باغ ہوا پر کھلا ہوا
آتش سے گل کھلے ہیں یہ روشن دلیل ہے
قندیل کیا نمونۂ باغ خلیل ہے

(۱۸)

ساطع یہاں[۱۶] کے فرش سے ہے مثل عرش نور
ایواں کی چاندنی سے تجلی ہے دور دور
شمعوں کو اپنی جلوہ فروزی پہ ہے غرور
گویا سر مزار ہے روشن چراغ طور
قدسی ہیں محو قدرت پروردگار پر
پروانہ جبرئیل ہیں شمع مزار پر

(۱۹)

دیکھے نکل کے روضہ سے گر صحن دلکشا
آئے کبھی پسند نہ فردوس کی ہوا[۱۷]
آتی ہے مل کے روضۂ انور سے جب ہوا
چھڑکاؤ فرش خاک پہ ہوتا ہے عطر کا
کیوں کر ہوا بند ھے نہ جہاں کی شمیم پر
ہیں لخلخے کھلے ہوئے دوش نسیم پر

(۲۰)

اپنی جگہ پہ فرد ہے گلدستۂ اذاں
بلبل کی طرح جس پہ موذن ہے نغمہ خواں
سرو بہشت اس کو سمجھتی ہیں قمریاں
ہم سے گناہ گاروں کا لیکن ہے یہ گماں
یاں کام مغفرت سے ہے، بخشش پسند ہے
دست اماں نجات کی خاطر بلند ہے

(۲۱)

اب وصف آب نہر میں دُر ریز ہے زباں
اک آئینہ ہے اس کی لطافت ہو کیا بیاں
حلقے ہیں چشم حور کے گرداب سے عیاں
تسنیم و سلسبیل کا رضواں کو ہے گماں
خود نہر سیر دیکھتی ہے آب و تاب کی
ہیں زورقیں چھٹی ہوئی ہر سو حباب کی

(۲۲)

با آبرو و عین کرم، منبع صفا
شفاف و صاف، مخزن فیض و گراں بہا
پاکیزہ و لطیف و سبک، صاحب عطا
پر اس کے تیرگی کا یہ روشن سبب ہوا
طوفاں میں جو سفینۂ عالم پناہ ہے
ماتم میں اس کے پانی کی چادر سیاہ ہے

(۲۳)

فوارے حسن صنعت صانع پہ ہیں گواہ
ہے قمریوں کو سرو لب جو کا اشتباہ
گویا ہیں بہر مردم آبی یہ خضر راہ
خیرہ ہے جن کی چھوٹ سے خورشید کی نگاہ
فرط ضیا سے نور سحر کے عمود ہیں
دھاریں نہیں خطوط شعاعی نمود ہیں

(۲۴)

ہیں نہر کے قریب شگفتہ چمن چمن
صد برگ و نرگس و گل نسرین ونسترن
کس رنگ پر ہیں سنبل و ریحان و یاسمن
گلہائے اشرفی کا ہے سب سے جدا چلن
رائج جو نقد بو و لطافت کے پائے ہیں
گلشن میں اپنے نام کے سکہ بٹھائے ہیں

(۲۵)

لبریز ہیں گلوں کے مئے رنگ سے ایاغ
سب پھول اس چمن کے خوشی سے ہیں باغ باغ
نرگس کو کچھ مرض ہے نہ لالے کے دل میں داغ
پائے نہ ایسا باغ جو لے کر پھرے چراغ
مطلب ہے کچھ خزاں سے نہ کھٹکا ہے خار کا
بلبل کا آشیانہ ہے مسکن بہار[۱۸] کا

(۲۶)

ظاہر ہے آفتابے سے خورشید کی چمک
دریا کی ہے یہ لہر کہ سبزے کی ہے لہک
طوبیٰ گلوں میں ہے گل فردوس کی مہک
کندن میں کب ہے جو ہے زر ورد[۱۹] میں دمک
مٹی ہوئے ہیں رنگ گل آفتاب کے
ہیں ہر طرف کھلے ہوئے تختے گلاب کے

(۲۷)

مرغوب سبزہ زار بھی ہے، لالہ زار بھی
پھولوں میں بوئے خوش بھی ہے، رنگ بہار بھی
کیا تن رہے ہیں سرو لب جوئے بار بھی
اپنی جگہ پہ نوک کی لیتے ہیں خار بھی
تحلیل جسم ہے پہ نظر بوستاں پہ ہے
تسبیح باغبان ازل کی زباں پہ ہے

(۲۸)

جنت سے بھی یہاں ہے نظارت زیادہ تر
سرسبز برگ برگ ہے خرم شجر شجر
ہیں محو بوستاں کی حکایت میں جانور
تیار بحث پر ہیں عنادل اِدھر اُدھر
نغموں سے ان کے وجد میں کچھ ایسے آئے ہیں
ہر گل نے اپنے کان اُدھر کو لگائے ہیں

(۲۹)

چھائے ہوئے ہیں نہر پہ اشجار میوہ دار
اک اک روش پہ فرش مشجر کی ہے بہار
تحریک سے ہوا کی جو جھکتے ہیں بار بار
پانی میں ڈوب جاتے ہیں اثمار خوشگوار
ایما یہ ہے کہ خلد کے بوئے ہوئے ہیں ہم[۲۰]
تسنیم وسلسبیل سے دھوئے ہوئے ہیں ہم[۲۱]

(۳۰)

سدرہ کا ارتفاع درختوں سے ہے عیاں
طوبا کا شاخ شاخ پہ رضواں کو ہے گماں
ہر اک شجر ہے مہبط انوار حق یہاں
بیجا نہال طور کی ہیں لن ترانیاں
پیدا جو اس زمین سے ہے لا جواب ہے
سبزہ نہیں یہ خضر طریق ثواب ہے

(۳۱)

نخل بہی و سیب و رطب سب ہیں بار دار
بادام پر ہے دیدۂ محبوب کی بہار
دیکھے سے جن کے ہوتی ہے فرحت وہ ہیں انار
نازک ہے ایسا پوست کہ دانے ہیں آشکار
کیا طرفہ ذائقہ بھی پھلوں میں سما گیا
دیکھا جو آنکھ اٹھا کے مزا منھ میں آ گیا

(۳۲)

انگور تر ٹپکتے[۲۲] ہیں تاکوں سے متصل
خوشبو سے ان کی عقد ثریا بھی ہے خجل
مائل نہ کس طرح ہو نزاکت پہ ان کی دل
باد صبا کے چلنے سے ہوتے ہیں مضمحل
ہیں جھوم کر بلند کبھی، گاہ پست ہیں
انگور خود شراب تولا سے مست ہیں

(۳۳)

منظور تھا کہ ہو ابھی وصف گل و ثمر
انگور کے بیاں سے مگر شق ہوا جگر
یہ ذکر سم کی طرح ہوا دل پہ کارگر
یاد آگئی شہادت سلطان بحر و بر
صدمہ ہوا تھا روح رسالت مآب کو
افسوس اس میں زہر دیا تھا جناب کو

(۳۴)

یہ حال یوں کتب میں بہ تفصیل ہے رقم
مالک ہوا جو تخت کا مامون بد شیم
سکہ کی طرح خلق میں رائج ہوا ستم
اجلاف کو خوشی ہوئی، اشراف کو الم
مرگ پدر سے خاک تھا کناسیوں[۲۳] کا دور
تازہ کیا سپہر نے عباسیوں کا دور

(۳۵)

خلق اس کے عہد میں جو رہے امن سے معاف
اس کی سیاہ بختی[۲۴] سے روشن ہوا یہ صاف
کافور نام رکھتے ہیں زنگی کا[۲۵] برخلاف
شیطان سے دو چند تھا ناری میں کبر ولاف
شہرت ہوئی جہان میں اس بوالفضول کی
ہر شہر کے رئیس نے بیعت قبول کی

(۳۶)

برپا ہوا حجاز و یمن میں مگر فساد
سادات اس شقی سے رہے برسر عناد
بیعت کو ایک جالی[۲۶] بر آئی نہ یہ مراد
دونوں جگہ کے لوگ ہوئے عازم جہاد
دن رات اس کو فکر تھی رنج عظیم تھا
دل غازیوں کی تیغ کے ڈر سے دو نیم تھا

(۳۷)

شوریٰ کے بعد رائے کا اس پر ہوا قرار
آئیں اگر امام زماں[۲۷] آسماں وقار
سب ملک کے سپرد کئے جائیں کاروبار
سادات جانتے ہیں انہیں فخر روزگار
دل مطمئن ہو[۲۸] خاطر ناشاد شاد ہو
فتنہ کسی طرح کا نہ کوئی فساد ہو

(۳۸)

آخر گئے پیام طلب لے کے اہل شر
اس امر پر مصر ہوئے حد سے زیادہ تر
گھر میں بھی رہنے پائیں نہ سلطان بحر و بر
مجبور ہو کے آپ ہوئے عازم سفر
اہل وطن کے طالع بیدار سو گئے
سامان پھر تباہیٔ یثرب کے ہو گئے

(۳۹)

پہنچی خبر سفر کی مدینہ میں جا بجا
سننا تھا یہ کہ شہر میں اک تہلکہ پڑا
آرام درد سے کسی پہلو نہ دل کو تھا
احباب سب ہوئے غم فرقت میں مبتلا
تا آسماں بلند صدائے بکا ہوئی
شیعوں کے گھر میں ایک قیامت بپا ہوئی

(۴۰)

(۲۹)تیر الم دلوں میں جگر میں سنان غم
تھا یہ سفر نہ کچھ سفر کربلا سے کم
روتے تھے مرد، پیٹتی تھیں عورتیں بہم
غل تھا کہ ہائے جاتے ہیں شاہنشۂ امم
بنتی ہے کچھ کسی سے جو قسمت بگڑتی ہے
افسوس پھر مدینہ کی بستی اُجڑتی ہے

(۴۱)

ویراں ہے شہر کوچہ و بازار ہیں اداس
دل پر دکانداروں کے چھائی ہوئی ہے یاس
(۳۰)سب دور نوع عیش سے ہیں، جنس غم ہے پاس
برہم معاملے ہیں ٹھکانے نہیں حواس
سنگ الم ہے سینہ پہ جوش و خروش ہے
بیع و شرا ہو خاک کہ سودے کا جوش ہے

(۴۲)

ہیں اس طرف سفر کے تردّد میں خود امام
خدام جان و دل سے ہیں مصروف اہتمام
رخصت کو لوگ حاضر دربار ہیں تمام
گریاں مفارقت کے الم سے(۳۱) ہیں خاص و عام
روتے ہیں سب صدائے فغاں دور جاتی ہے
ماتم کی اہلبیتؑ کے آواز آتی ہے

(۴۳)

آ آ کے عرض کرتے ہیں خدمت میں دوستدار
واللہ دل ہیں ہجر کے صدمے سے بے قرار
ہر اک کو اس قدم کی جدائی ہے ناگوار
مفقود اب ہے صورت تسکین جان زار
وہ رنج ہیں دلوں پہ کہ خادم ہلاک ہیں
تیغ مفارقت سے جگر چاک چاک ہیں

(۴۴)

ارشاد یہ تو کیجئے یا شاہ بحر و بر
کتنے دنوں میں قصد پھر آنے کا ہے ادھر
احباب سے یہ کہتے ہیں حضرت بچشم تر
گذرے گی جو وہاں تمہیں پہنچے گی(۳۲) سب خبر
چھٹنا ہمیں بھی تم سے بہت ناگوار ہے
پر کیا کریں کہ جبر میں کیا(۳۳) اختیار ہے

(۴۵)

چھٹتا ہے ہم سے روضۂ محبوب ذوالجلال
سوہانِ جان زار ہے اس امر کا ملال
مدنظر نہیں مجھے ہمراہیٔ عیال
ان کی مفارقت کا بھی ہے رنج و غم کمال
صدمے ہزار طرح کے ہیں جان زار پر
چلتے ہیں پر مشیت پروردگار پر

(۴۶)

فرما کے یہ محل میں گئے سید[۳۴] امم
دیکھا کہ اہلبیتؑ میں برپا ہے بزم غم
فرقت میں شہ کی روتی ہیں سیدانیاں بہم
بیتاب مثل ماہیٔ بے آب ہیں حرم
وابستگان رشتۂ الفت ہلاک ہیں
دامن ہیں تار تار گریبان چاک ہیں

(۴۷)

موزوں کا ہے خیال نہ کچھ چادروں کا ہوش
مقنعے ہیں تار اشکوں کی رقت کا ہے یہ جوش
برپا کسی کی آہ کا ہے تا فلک خروش
تصویر کی طرح کوئی حیرت میں ہے خموش
سب بے حواس ہیں تن و جاں کی خبر نہیں
گویا کہ اک مرقع ماتم ہے گھر نہیں

(۴۸)

یوں تو سب اہلبیتؑ پریشان ہیں کمال
حضرت کی ہے بہن کا مگر کچھ عجیب حال
سن سن کے حال کوچ ہوئی جاتی ہیں نڈھال
گویا بدن سے روح کا ہوتا ہے انتقال
صدمہ یہ ہے کہ منھ سے نہیں بول سکتی ہیں
زینب کی طرح یاس سے بھائی کو تکتی ہیں

(۴۹)

آکر قریب کہتے ہیں شاہنشہؑ زمن
لِلّٰہ کچھ کہو تو یہ کیا حال ہے بہن
چہرے کا رنگ فق ہے لرزتا ہے سب بدن
طاری یہ ضعف ہے کہ نہیں طاقت سخن
شور فغاں[۳۵] پسند نہیں کردگار کو
سمجھاؤ کچھ تو اپنے دلِ بے قرار کو

(۵۰)

کھولے ہیں سر کے بال پریشاں ہو اس قدر
دنیا میں کیا بہن کوئی کرتا نہیں سفر
اکثر نکل کے گھر سے پھر آتے بھی ہیں بشر[۳۶]
آئیں گے اب نہ ہم تمہیں کیونکر ہوئی خبر
امید ہے تسلی خاطر کے واسطے
ہوتا نہیں یہ حال مسافر کے واسطے

(۵۱)

دراصل ہے یہ دار فنا خانۂ محن
پابند غم ہیں تابع مرضیٔ ذوالمنن
صبر و رضا تمہارے گھرانے کا ہے چلن
سختی میں شکر اجر کا موجب ہے اے بہن
بندوں کو صبر گھر کی تباہی میں چاہئے
حرف رضا قضائے[۳۷] الٰہی میں چاہئے

(۵۲)

ہمنام فاطمہؑ ہو مناسب ہے تم کو صبر
تھا اختیار کیا[۳۸] جو اٹھانا پڑا یہ جبر
برساؤ مینہہ نہ اشک کا روؤ نہ مثل ابر
جو آئے ہیں جہاں میں وہ جائیں گے سوئے قبر
گھٹتی نہیں[۳۹] یہ راہ عزیزوں کے ساتھ سے
ڈگنا قدم کا اجر کا دینا ہے ہاتھ سے

(۵۳)

صبر و رضائے حضرت زینبؑ ہے یادگار
کس طرح جان و دل سے برادر پہ تھیں نثار
در پے ہوا جفا کا جو یہ چرخ کجمدار
آخر گلے پہ بھائی کے دیکھی چھری کی دھار
کانپا فلک زمین کا طبقہ اُلٹ گیا
زینبؑ کے سامنے سر شبیرؑ کٹ گیا

(۵۴)

جس دم تھے زیر خنجر قاتل امامؑ دیں
عصمت سرا سے نکلی تھیں گو زینبؑ حزیں
پر آہ بھی زبانِ مبارک سے کی نہیں
ہاتھوں سے دل سنبھال کے خیمہ میں پھر گئیں
اشکوں کے ساتھ کٹ کے کلیجہ نکل پڑا
جوہر میں پر نہ صبر کے مطلق خلل پڑا

(۵۵)

ایسوں نے جبر اٹھائے ہیں ان آفتوں میں جب
پھر میرے ہجر کا تو کچھ ایسا نہیں تعب
حاکم کے گھر بشوق ہوئی ہے مری طلب
چندے اگر بہ لطف بسر ہو تو کیا عجب
ہوگا جو بعد اس کے کسی کو خبر نہیں
لیکن ابھی تو کچھ بھی مقام خطر نہیں

(۵۶)

سن سن کے یہ کلام شہنشاہ دیں پناہ
کرتی ہیں[۴۰] عرض بھائی سے اپنے بہ اشک و آہ
ارشاد یہ درست ہے اے حجت الٰہ
لیکن نہیں ہے قلب پہ قابو خدا گواہ
میں تابع رضائے شہ ذی وقار ہوں
واقف مگر خدا ہے کہ بے اختیار ہوں

(۵۷)

خود جی میں اپنے کہتی ہوں میں یا شہؑ انام
کیا اس قدر سفر میں تردد کا ہے مقام
چاہا اگر خدا نے تو پھر آئیں گے امامؑ
دل مانتا نہیں مگر اس طرح کے کلام
رہ رہ کے ہول اٹھتے ہیں کچھ غیر حال ہے
میں کیا کہوں زباں سے جو دل کو خیال[۴۱] ہے

(۵۸)

جاری ہیں آپ کی بھی زباں پر کلام یاس
بھیا! بتایئے مجھے کیوں کر نہ ہو ہراس
اس زار و ناتواں کو نہیں ہے کسی کی آس
جب آپ بھی چلے تو رہا کون میرے پاس
حضرت چھٹے تو قبر ہے بہتر مکان سے
ہے اس سفر میں کوچ ہمارا جہان سے

(۵۹)

اور حالِ صبر حضرت زینبؑ کا ذکر کیا
کیسی مصیبتوں میں رہیں تابعِ خدا
بیٹوں کے سر جدا ہوئے منہ سے نہ کچھ کہا
لاشے جو آئے رن سے تو سجدے کئے ادا
یہ سب تھا پر نہ اُٹھ سکے صدمے جدائی کے
ہر حال میں وہ ساتھ رہیں اپنے بھائی کے

(۶۰)

منظور بس مجھے بھی ہے ہمراہیٔ امام
تنہا نہ چھوڑیئے مجھے یا سرور انام
جس گھر میں ہوں نہ آپ پھر اس گھر[۴۲] سے کیا ہے کام
گھٹ گھٹ کے اس مکان میں ہو جاؤں گی تمام
موت آئے گی فراق شہ دیں پناہ میں
پہنچے گی آپ کو خبر مرگ راہ میں

(۶۱)

شہؑ نے کہا کہ منہ سے نکالو نہ یہ سخن
اس غم میں صبر دے تمہیں خلاق ذوالمنن
چاہے جو وہ تو سہل ہے ہر صدمہ و محن
کٹ جائیں گے یہ دن بھی نہ گھبراؤ اے بہن
بیتاب اس قدر نہ ہو میری جدائی سے
تم تو بہن ملوگی بہت جلد بھائی سے

(۶۲)

نکلے گی کوئی شکل، مسبب ہے ذوالجلال
بیکار چند روز کی فرقت کا ہے خیال[۴۳]
باقی[۴۴] نہیں رہے گا، زمانے کو ہے زوال
لکھنا ہمیں خطوں میں مفصل تم اپنا حال
دن رات انتظار میں آنے کے رہتے ہیں
مکتوب کو ہی نصف ملاقات کہتے ہیں

(۶۳)

لو الوداع جاتے ہیں آؤ گلے ملو
جانے دو اب نہ اشک بہاؤ گلے ملو
گوشہ(۴۵) ردا کا منہ سے ہٹاؤ گلے ملو
ہوتی ہے دیر ہاتھ بڑھاؤ گلے ملو
بیتاب سب کے غم سے دل ناصبور ہے
روضہ پہ مصطفیؐ کے بھی جانا ضرور ہے

(۶۴)

کہتے تھے یہ کہ جانب دختر گئی نگاہ
کمسن ابھی ہے مثل سکینہؑ وہ رشک ماہ
بیتاب درد دل سے ہوئے شاہ دیں پناہ
دو تین بار منہ سے کہا آہ آہ آہ
اولاد کے فراق میں کیا دل کو کل پڑے
روکا بہت پر آنکھوں سے آنسو نکل پڑے

(۶۵)

مجبور ہوگئے دلِ ناشاد کام سے
آنسو نہ تھم سکے شہؑ عالی مقام سے
معصوم بھی ڈری تھی بچھڑنے کے نام سے
باہیں گلے میں ڈال کے لپٹی امام سے
تھے دونوں ہاتھ دوسرے شانے پہ آپ کے
روتی تھی منہ دھرے ہوئے کاندھے پہ باپ کے

(۶۶)

بہلا کے اس کو گود سے جب لے گئے حرم
رخصت ہوئے ہر ایک سے پھر سید امم
فرزند کو قریب بلایا بچشم نم
فرمایا آؤ مل لو کہ وقفہ بہت ہے کم
جتنے قریب ہیں وہ مسافر سے سب ملیں
بچھڑے ہوئے عزیز خدا جانے کب ملیں

(۶۷)

رویا یہ کہہ کے لخت دل سید عرب
انجام کے خیال سے دل پر ہوا تعب
دینار دس ہزار سے زائد کئے طلب
حصوں سے کامیاب ہوئے اہلبیتؑ سب
تھا حسب قدر لطف و کرم سب کے حال پر
تقسیم سیم و زر ہوا اہل و عیال پر

(۶۸)

گھر سے وداع ہو کے جو نکلے شہ انام
اک غل ہوا محل سے برآمد ہوئے امام
تھے انتظار میں در دولت پہ خاص و عام
بڑھ کر مصافحہ سے مشرف ہوئے تمام
چومے ادب سے دست مبارک حضور کے
پروانہ وار گرد پھرے شمع نور کے

(۶۹)

روضہ پہ مصطفیؐ کے چلے قبلہ امم
راہی ہوئے جلو میں سب اصحاب ذی حشم
بالیدہ اپنے اوج پہ کیا کیا ہوا حرم
محراب دور سے ہوئی بہر سلام خم
آمد کے غل نے شور قیامت بپا کیا
ہر ایک در نے شوق میں آغوش وا کیا

(۷۰)

جب داخل رواق پیمبرؐ ہوئے امام
پہلے پڑھی زیارت سلطان خاص و عام
بعد طواف آپ بڑھے بہر استلام[۴۶]
بوسے دیئے[۴۷] ضریح نبیؐ پر[۴۸] باحترام
سنبھلا گیا نہ پھر دل و جان بتولؑ سے
روئے لپٹ کے خوب ضریح[۴۹] رسولؐ سے

(۷۱)

کی عرض قبر پاک نبیؐ سے بچشم نم
واقف ہیں آپ دل پہ جو ہے صدمہ و الم
اس قبر کا فراق ہے میرے لئے ستم
درپیش ہے سفر[۵۰] مگر اٹھتے نہیں قدم
کس طور سے ہو صبر دل ناصبور سے
جی چاہتا نہیں کہ جدا ہوں حضور سے

(۷۲)

کیوں کر نہ مثل ماہیٔ بے آب ہوں تپاں
افسوس اب یہ قبر کہاں اور میں کہاں
کیا ظالموں کے ظلم وتعدی کا ہو بیاں
پائی نہ میں نے آپ کے روضہ میں بھی اماں
غربت میں لطف کیا ہے لحد گر کہیں ملے
جور فلک سے یاں کی نہ دو گز زمیں ملے

(۷۳)

پائین پا رہا نہ یہ مضطر ہزار حیف
قرب آپ کا ہوا نہ میسر ہزار حیف
چھٹتا ہے یہ مزار منور ہزار حیف
لے کر چلا وطن سے مقدر ہزار حیف
تڑپوں گا جب پڑھوں گا زیارت میں دور سے
افسوس ظالموں نے چھڑایا حضور سے

(۷۴)

خادم غریب خانہ میں کس طرح امن پائے
تقدیر چاہتی ہے کہ غربت میں موت آئے
بنتی نہیں ہے اب کوئی صورت بغیر جائے
چھوٹی یہ قبر پاک مجاور سے ہائے ہائے
کھاؤں گا غم سفر کا، الم دل پہ شاق ہے
زاد مسافرت زرِ داغ فراق ہے

(۷۵)

آیا ہے بارگاہ میں رخصت کو جاں نثار
در پے ہے اب فراق کا یہ چرخ کج مدار
راحت کے دن گذر گئے برہم ہے روزگار
باقی نہیں ہے اب کوئی امید زینہار
کس طرح صبر ہو دل پر اضطراب سے
خادم کی ہے یہ آخری رخصت جناب سے

(۷۶)

لے اے مزار احمد مختارؐ الوادع
اے قبر پاک سید ابرارؐ الوداع
جاتے ہیں، اب ضریح ضیا بارؐ الوداع
اے بام و سقف اے در و دیوار الوداع
غربت میں روح چین نہ اک آن پائے گی
ہر ایک شے یہاں کی ہمیں یاد آئے گی

(۷۷)

یہ کہہ کے بے قرار ہوئے شاہ ذی وقار
پھر قبر سے لپٹ گئے با چشم اشک بار
سہرا ضریح پاک کا تھا آنسوؤں کا تار
چادر چڑھا رہے تھے دُر اشک آب دار
اشکوں سے تر تھی قبر، رسالتؐ پناہ کی
ہر بار تھی بلند صدا آہ آہ کی

(۷۸)

تسکین دے کے دل کو جو باہر چلے جناب
بس صحن میں پہنچ کے رہی قلب کو نہ تاب
پھر روضۂ شریف میں داخل ہوئے جناب[۵۱]
ظاہر ہر ایک بات سے ہوتا تھا اضطراب
[۵۲]مضموں حدیث کا ہے کہ تھے بے قرار آپ
رخصت اسی طرح سے ہوئے چند بار آپ

(۷۹)

آخر چلے مزار نبیؐ سے بچشم نم
آنکھیں ملائکہ نے بچھائیں قدم قدم
گھوڑے پہ جب سوار ہوئے قبلہ امم
ساتوں فلک سلام کو خم ہوگئے بہم
چھٹکا جو نور روئے ثریا جناب[۵۳] کا
ذروں کی ضو سے پھر گیا رخ آفتاب کا

(۸۰)

آگے بڑھا جلوس سواری ہوئی رواں
جادوں[۵۴] کی ضو سے چھپ گئی گردوں پہ کہکشاں
دعویٰ کیا زمیں نے کہ اب میں ہوں آسماں
شمس و قمر ہیں چرخ پہ ایسے قدم کہاں
اس خاک پا سے آج مجھے اکتساب ہے
ذرہ جو میری خاک کا ہے آفتاب کا

(۸۱)

اللہ رے سواریٔ مولا کا احترام
اقبال پیش رو ہے جلودار احتشام
جاہ و جلال آپ ہیں مصروف اہتمام
شوکت کے ہاتھ میں ہے رکاب شہؑ انام
کیا پُر جگر جوان ہیں نیچے نشان کے
سرہنگ دبدبہ سے دبے ہیں جہان کے

(۸۲)

ارواح انبیاؑ کی صفیں ہیں اِدھر اُدھر
ہمراہ قدسیوں کے پرے ہیں کشادہ پر[۵۵]
کروبیان عرش دکھاتے ہیں کر و فر
میکال و جبرئیل کے ہاتھوں میں ہیں چنور
ہے ترقو[۵۶] کا شور کبھی گہہ درود کا
سر پر ہے چتر سایۂ رب ودود کا

(۸۳)

ہے بانگ دور باش سے یہ رعب کا وفور
اصحاب خاص پاس ادب سے ہیں دور دور
ہلتے ہیں دل یہ سطوت مولا کا ہے ظہور
بے اذن ایک کو بھی نہیں طاقت حضور
آوازِ رعد حکم شہنشاہ دیں کا ہے
کیسی زمیں فلک پہ بھی ڈنکا انہیں کا ہے

(۸۴)

دیتے ہیں بار بار یہ آواز خیرخواہ
تابندہ باد نیرِ اقبالِ بادشاہ
آباد یہ سپاہ، سلامت جہاں پناہ
حضرت کے دوست شاد، عدو آپ کے تباہ
افزود خلق پر ہو کرم بادشاہ کا
سایہ رہے ہر ایک پہ ظل الٰہ کا

(۸۵)

اللہ رے فیض مقدم[۵۷] نوبادۂ رسولؐ
یُمنِ قدم سے بن گئے جنگل کے خار پھول
سر سبزیاں زمین کے طالع کو ہیں حصول
تھا چرخ اخضری یہ شرف دیکھ کر ملول
مطبوع خضر رنگ تھے اس ارض پاک کے
گردوں بھی زہر کھائے تھا سبزے پہ خاک کے

(۸۶)

اعجاز نخل طور تھا ہر نخل سے نمود
جاری زبان برگ پہ ہر بار تھا درود
غل طائروں میں تھا کہ زہے رحمت ودود
آج اس زمیں پہ فخر سلیمانؑ کا ہے ورود
آمد کے تذکرے سے دلوں کو نشاط تھا
ہر داستاں میں لطف حدیث بساط تھا

(۸۷)

ہر بار شاخ گل پہ چہکتی تھی عندلیب
نغمے یہ تھے کہ باد بہاری ہے اب قریب
ہے سرو باغ دیں کی زیارت زہے نصیب
مژدہ یہ بہر نرگس بیمار ہے طبیب
کیوں کر مریض ہجر نہ ہوں انتظار میں
خاک شفا کا صاف اثر ہے غبار میں

(۸۸)

رستے میں نور وادیٔ ایمن تھا جلوہ گر
تھا رشک نخل طور ہر اک راہ کا شجر
داغی جو برگ تھے وہ بنے غیرت قمر
آئینے رہگذر میں ہوئے نصب ادھر ادھر
فرط ضیا کو دیکھ کے خورشید دنگ تھا
اک اک شجر پہ سرو چراغاں کا ڈھنگ[۵۸] تھا

(۸۹)

مٹھی میں گل لئے ہوئے تھے زر پئے نثار
غنچے بھی ہنس رہے تھے کہ ہے آمد بہار
کحل بصر جو باد بہاری کا تھا غبار
نرگس کو تھا ورودِ سواری کا انتظار
استادہ ہر نہال تھا تعظیم کے لئے
شاخوں نے سر جھکائے تھے تسلیم کے لئے

(۹۰)

یوں تھا سواد فوج میں لخت دل بتولؑ
جاتے تھے جس طرح شب معراج میں رسولؐ
شبدیز کو براق کا تھا مرتبہ حصول
یاں اور خوش خراموں کے دعوے ہیں ناقبول
صدقے ہے دل بھی کبک کا ایک ایک گام پر[۵۹]
پریوں کی جان جاتی ہے[۶۰] طرز خرام پر

(۹۱)

ہر ایک سم ہے بدر ہر اک نعل ہے ہلال
آغوش ماہ نو میں قمر ہے زہے کمال
کیلوں کی اختروں سے کچھ اعلا نہیں مثال
مہر مبیں کو نقش قدم سے ہے انفعال
کم ہے عروج ماہ کا اس ارتفاع پر
کیلوں کی ضو گواہ ہے تحت الشعاع پر

(۹۲)

شل اس فرس کے سامنے ہیں آہوئے تتار
اک اک قدم پہ ہوتے ہیں پریوں کے دل نثار
ہیں اپنے پاؤں دیکھ کے طاؤس شرمسار
چلنے میں کبک ٹھوکریں کھاتے ہیں بار بار
پائے گا کوئی کیا فرس تیزپا کا دم
اُکھڑے گا ساتھ چلنے میں اس کے ہوا کا دم

(۹۳)

ہے نام ابر، برق بھی ایک اس کا اسم ہے
جس کا کوئی قسیم نہیں یہ وہ قسم ہے
تیزی بھری ہے آگ کا ہر عضو جسم ہے
ہے یہ رگوں کا جال کہ بند طلسم ہے
کس طرح آئے صنعت حکمت[۶۱] قیاس میں
لے آئی ہے ہوا کو فرس کے لباس میں

(۹۴)

نازک مزاج بھی ہے یہ اور بردبار بھی
سیماب بے قرار بھی کوہ وقار بھی
خود بھی ہرن ہے ضیغم آہو شکار بھی
بادِ سموم بھی ہے نسیم بہار بھی
ہے اس کی مدح سے یہ روانی زبان میں
چلتا ہے ذکر، چال[۶۲] کا اب تک جہان میں

(۹۵)

ہو سرعتِ سمند صبادم اگر رقم
ٹھہرے نہ پھر ورق پہ کہیں ادہم قلم
بندش کا ذکر کیا ہے[۶۳] کہ لفظیں نہ ہوں[۶۴] بہم
کاغذ رہے سفید اُڑیں حرف دم بدم[۶۵]
صرصر سے تیز خامہ سرعت نگار ہو
جس خط میں ہو یہ حال وہ خط غبار ہو

(۹۶)

لے کر فرس کا نام جو کوئی کرے سفر
راہی ہو یوں کہ پاؤں نہ رکھے زمین پر
منزل پہ مثل اشک پہنچ جائے وہ بشر
ادنیٰ سا ہے یہ سرعت شبدیز کا اثر
بے چین ہو ہوا بھی جو لگ جائے زین میں
ہو گرم رو تو آگ لگ اُٹھے زمین میں

(۹۷)

شائستگی میں نرم روی میں ہے لاجواب
تھم کر چلے تو باد بہاری کو ہو حجاب
زیر قدم ہے[۶۶] سبزۂ خوابیدہ محو خواب
لپٹے ہوئے سموں سے ہیں سب ہمرہ رکاب
دل باغ باغ ہیں یہ[۶۷] سواری کی چال ہے
ساری نسیم صبح بہاری کی چال ہے

(۹۸)

جاتے ہیں اس جلال و حشم سے شہ انام
ہے ساتھ جاہ و کوکبہ و شوکت تمام
جس ملک کی زمین پہ فرماتے ہیں مقام[۶۸]
برپا وہیں پہ ہوتے ہیں بیچوبہ و خیام[۶۹]
قدسی طواف کرنے کو گردوں سے آتے تھے
جبریل فرش اپنے پروں کا بچھاتے تھے

(۹۹)

ہوتا تھا صدر میں تو بپا خیمہ حضور
اور دور میں خیام رفیقان ذی شعور
پاس ادب سے لوگ اترتے تھے دور دور
ہوتا تھا رنگ رنگ کے خیموں سے کیا ظہور
آگے قدم وہاں سے نہ رہرو بڑھاتا تھا
ہر ایک لطف، شہر کا جنگل میں پاتا تھا

(۱۰۰)

اس نور کبریا کا جہاں پر ہوا مقام
منزل وہ رشک وادیٔ ایمن بنی تمام
جس ملک کی زمیں پہ ہوئے آپ کے خیام
وہ فرش مرتبہ میں ہوا عرش احتشام
دی منزلت جو خیمۂ رفعت نشان نے
بوسے زمیں کے جھک کے لئے آسمان نے

(۱۰۱)

اللہ ری شان خیمہ سلطان دیں پناہ
اس پردے میں تھی جلوہ فگن رحمت الٰہ
کس طرح محو بوقلمونی نہ ہو نگاہ
غل تھا طلسم قدرت حق ہے یہ بارگاہ
شہبال قدسیان فلک اس کا فرش ہے
(۷۰)چوٹی کلس کی طرۂ دستار عرش ہے

(۱۰۲)

رتبہ میں اس سے پست ہیں فردوس کے قصور
عرش، آسماں زمین سمجھتی ہے کوہ طور
کوتاہ ہر طناب سے زلف دراز حور
ہر ایک چوب میں ہے عمود سحر کا نور
تا آسماں ضیائے کلس کا صعود ہے
طور کلیم سے ید بیضا نمود ہے

(۱۰۳)

شمسہ کا سر پہ خیمہ کے رکھا گیا جو تاج
بیچوبۂ فلک نے بھی دب کر دیا خراج
ایما یہ تھا کہ دور ہے دنیا میں میرا آج
احکام کا قنات کے شقوں سے ہے رواج
ہے کون مدعی یہ شرف کس نے پائے ہیں
چوبوں نے بے مثالی کے ڈنکے بجائے ہیں

(۱۰۴)

آتے تھے جب قریب کسی ملک کے امام
نذریں لئے نکلتے تھے ہر گھر سے خاص و عام
ہوتا تھا دعوتوں کا رئیسوں میں اہتمام
ہوں باریاب، تھے اسی امید میں تمام
باشندگان شہر زیارت کو جاتے تھے
سردار پیشوائی کو حضرت کی آتے تھے

(۱۰۵)

آتے تھے روز و شب در دولت پہ نامدار[۷۱]
ہوتے تھے کشتیوں میں ہدایائے[۷۲] بے شمار
نذروں کے ساتھ تھے طبق زر پئے نثار
کُل سرکشان دہر سراپا تھے انکسار
آنکھوں سے سر سے خدمت عالی میں آتے تھے
تحفے سب اُس دیار کے حضرت میں لاتے تھے

(۱۰۶)

ہوتے تھے خدمت شہ دیں میں جو باریاب
پاتے تھے حسن خلق[۷۲] رسولؐ فلک مآب
پیش آتے تھے نوازش و اکرام سے جناب
مسرور و شاد پھرتے تھے خدمت سے شیخ و شاب
موقوف تھا غریب پہ نے اہل مال پر
تھا حسب قدر، لطف و کرم سب کے حال پر

(۱۰۷)

ہر ایک خاص[۷۳] و عام جو ہوتا تھا بہرہ ور
تھی ذرے ذرے پر نظر کیمیا اثر
جو خوش عقیدہ سر کو جھکاتا تھا پاؤں پر
ملتے تھے اس سے اٹھ کے امام فلک[۷۴] سیر
ہر ایک سے خطاب ہر اک سے کلام تھا
ہنس کر جواب دیتے تھے کیا خلق[۷۵] عام تھا

(۱۰۸)

آ آ کے پوچھتے تھے مسائل جو شیخ و شاب
تسکین دل کو ہوتی تھی ملتا تھا وہ جواب
خلق خدا تھی ذات معلّٰی سے کامیاب
جاری تھا بحر فیض امام فلک جناب
ہر وقت میں خیالِ رفاہِ انام تھا
ہادی کو راہ میں بھی ہدایت سے کام تھا

(۱۰۹)

جو لوگ حاضرین سے تھے اہل اتّقا
اکرام ان کے حال پہ اوروں سے تھا سوا
باتیں انہیں سے کرتے تھے سلطان دو سرا
دل کی طرح سے دیتے تھے پہلو میں اپنی جا
مطلب ہر اک روا تھا مرادیں حصول تھیں
نذریں بھی دعوتیں بھی انہیں کی قبول تھیں

(۱۱۰)

تھے سالکِ طریق اسی طور سے امام
ہوتی تھیں اس سفر میں یونہی منزلیں تمام
اک روز ایک جا پہ جو پہنچے شہ انام[۷۶]
دامن میں اک پہاڑ کے اس دن ہوا مقام
وہ کوہ ہم ترازوئے کوہ رقیم تھا
اک عابد خجستہ سیر واں مقیم تھا

(۱۱۱)

مدت سے غار کوہ میں تھا [۷۷](ایسے جا) گزیں
مشغول تھا عبادت حق میں وہ مرد دیں
ہر وقت تھی جو یاد خداوند عالمیں
سجدے سے کوئی آن اٹھاتا نہ تھا جبیں
قدسی تھے محو اس کی عبادت کے ڈھنگ پر
لوح جبیں کے نقش اٹھ آئے تھے سنگ پر

(۱۱۲)

کندہ تھا سنگ سنگ پہ سجدوں کا اس کے حال
تھے شاہد قیام سب اس دشت کے جبال
لاغر تھا جسم رشتۂ تسبیح کے مثال
کامل جہاد نفس میں تھا پر وہ باکمال
لغزش رہ رضا میں نہ تھی کوئی دم اسے
حاصل تھا مثل کوہ، ثبات قدم اسے

(۱۱۳)

تقوا شعار و عارف و درویش باکمال
پرہیزگار و متقی و صادق المقال
عقبیٰ رسیدہ، تارک دنیا، نکو خصال
عبد مطیع و بندۂ مخصوص ذوالجلال
اوصاف نیک جمع تھے اس حق شناس میں
گویا کہ اک ملک تھا بشر کے لباس میں

(۱۱۴)

اس نے سنی جو یہ خبر میمنت اثر
اترا ہے آج یاں خلف سید البشرؐ
[۷۸]مسرور و شاد حد سے ہوا وہ زیادہ تر
سر کو قدم کئے ہوئے دوڑا وہ خوش سیر
پَر شوق نے لگا دیئے ٹھہرا نہ راہ میں
حاضر ہوا حضور شہہ دیں پناہ میں

(۱۱۵)

پہلے تو مجرا گاہ سے آداب کو جھکا
آئین خسروی سے بدستور پھر بڑھا
جب مدحت و ثنا و دعا لا چکا بجا[۷۹]
کھولا لبوں کو یوں[۸۰] پئے تمہید مدعا
حاصل ہوئی بس آج مراد دلی مجھے
تھا جس کی آرزو میں وہ دولت ملی مجھے

(۱۱۶)

مصروف جان و دل سے رہا کرتا تھا غلام
مدح و ثنا میں آپ کے اجداد کی مدام
تسبیح کیا تھی ذکر امام فلک مقام
مولا کا نام میرا وظیفہ تھا صبح و شام
تھی آرزوئے وصل دل بے قرار میں
آنکھیں سفید ہوگئی تھیں انتظار میں

(۱۱۷)

تھا مدتوں سے شوقِ قدم بوسیٔ جناب
رہتا تھا رات دن غم دوری سے اضطراب
خدمت سے بہرہ یاب نہ ہونے کا تھا حجاب
تھی پا شکستگی پہ سدا چشم آب آب
ہر دم گل ریاض نبیؐ کا خیال تھا
بلبل کی جو قفس میں ہو صورت، وہ حال تھا

(۱۱۸)

تھا انتظار مخدم[۸۱] سلطان بحر و بر
ہر شب اسی خیال میں ہوجاتی تھی سحر[۸۲]
کہتا تھا روز میں یہ سر راہ آن کر
اب تک کیا نہ جذبۂ[۸۳] دل نے مرے اثر
اس وقت تک یہ طالعِ پست، اوج پر نہ آئے
عرصہ ہوا مگر مرے مولا ادھر نہ آئے

(۱۱۹)

اک عمر اشتیاق میں جب یوں ہوئی بسر
تب نخل آرزو کو خدا نے دیا ثمر
آئے ہزار شکر، امامؑ ملک سیر
اب عرض یہ قبول ہو یا شاہؑ بحر و بر
ہوں مفتخر ورود مسرت لزوم سے
روشن فقیر خانہ ہو فیض قدوم سے

(۱۲۰)

بندے کو گو نہیں ہے لیاقت خدا گواہ
کیا ہو گدا سے دعوت سلطان دیں پناہ
پر ہے حضور کے کرم عام پر نگاہ
جویائے افتخار ہے یہ عبد خیرخواہ
مقبول بادشاہ جو عرض فقیر ہو
یہ مور ناتواں بھی سلیماں سریر ہو

(۱۲۱)

اللہ ری مروت نوباوۂ رسولؐ
اس مرد حق پرست کی خاطر نہ کی ملول
عابد کا التماس ضیافت ہوا قبول
سوئے جبل روانہ ہوا دلبر بتولؑ
راہی رکاب شاہ میں چھوٹے بڑے ہوئے
جتنے رفیق خاص تھے سب اٹھ کھڑے ہوئے

(۱۲۲)

خوش خوش چلا جلو میں وہ مرد خجستہ کار
عابد امام عصر کو لایا قریب غار
حجرہ وہ[۸۴] تنگ تھا کہ ہو غنچہ بھی شرمسار
مرغوب اختصار بہ[۸۵] مثل دہان یار
شیطاں کے واہمہ کا بھی اس جا گذر نہ تھا
آ جائیں پانچ شخص بھی ایسا وہ گھر نہ تھا

(۱۲۳)

لکھا ہے ساتھ آپ کے تھے تین سو نفر
عابد تھا اس لحاظ سے حیراں[۸۶] جھکائے سر
پہنچے جو در پہ غار کے سلطانؑ بحر و بر
لائے خدا کا نام مبارک زبان پر
امر محال امامؑ کے تھا اختیار میں
داخل ہوئے مع رفقا آپ غار میں

(۱۲۴)

بیٹھا جو اس جگہ بہ فراغت ہر اک بشر
عابد گرا حضور کے قدموں پہ دوڑ کر
سمجھا کہ ہے یہ معجزۂ شاہؑ بحر و بر
چومے ادب سے پائے امام نکو سیر
تھا دل میں شاد شاد زباں پر درود تھا
بشرے سے پر تردِدِ دعوت نمود تھا

(۱۲۵)

پایا اسے جو فکر میں حضرت نے مبتلا
خود مسکرا کے آپ نے عابد سے یہ کہا
احضارِ ماحضر میں تردد ہے تجھ کو کیا
تشویش کس لئے ہے جو موجود ہے[۸۷] وہ لا
دنیا کے ذائقوں سے یہ لب آشنا نہیں
ہم بے تکلفوں سے تکلف روا نہیں

(۱۲۶)

یہ سن کے ایک سمت کو عابد ہوا رواں
ہاتھوں میں کچھ لئے ہوئے آیا وہ میزباں
مقدار ما حضر کا مفصل ہو کیا بیاں
تھا ایک کوزۂ عسل اور تین قرص ناں
شرما کے سر جھکا لیا آقا کے سامنے
رکھا طعام سید والا کے سامنے

(۱۲۷)

کھانے پہ شہؑ نے ڈال دیا گوشۂ ردا
سمجھا نہ کوئی آپ نے کچھ زیر لب کہا
درویش کو قریب پھر اپنے بٹھا لیا
تقسیم کا طعام کی عہدہ اسے دیا
محتاج کو غنی کیا کل کے امیر نے
پہنچا دیا ہر ایک کو کھانا فقیر نے

(۱۲۸)

عابد کو دیتے جاتے تھے خود سرورؑ انام
اُٹھ اُٹھ کے سب کے سامنے رکھتا تھا وہ طعام
کھا کھا کے سیر ہوتے تھے کھانے سے خاص و عام
لیکن وہ تینوں روٹیاں ہوتی نہ تھیں تمام
دعوت کی بزم گرم تھی کچھ برہمی نہ تھی
درویش کے طعام میں جَو بھر کمی نہ تھی

(۱۲۹)

جب سیر ہوگئے رفقائے امامؑ سب
ہر ایک ہاتھ دھو کے بجا لایا شکر رب
درویش کو بھی حد سے زیادہ ہوا طرب
چومے قدم امامؑ امم کے بصد ادب
بھیجا درود آل رسولؐ کرام پر
لعنت کی دشمنان امام انام پر

(۱۳۰)

عابد سے پھر بہ لطف، مرخص ہوئے امام
آئے اسی جگہ پہ ہوا تھا جہاں قیام(۸۸)
باقی وہ روز اور ہوئی شب بھی جب تمام
ساماں ہوا سفر کا، اکھڑنے لگے خیام
احباب ساتھ چلنے پہ موجود ہوگئے
پھر رہگزائے منزل مقصود ہوگئے

(۱۳۱)

طے کرتے منزلوں کو چلے جب امام دیں
جنگل کسی جگہ پہ تو بستی ملی کہیں
تھی خیمہ گاہ شہ کبھی بغداد کی زمیں
گہہ قم کے پاس تھی کبھی کاشان کے قریں
جاری ہر اک مقام پہ فیض حضور تھا
مولا کے معجزات کا ہر جا ظہور تھا

(۱۳۲)

خدمت گزاریوں پہ مصر تھے جو خاص و عام
ہر شہر ہر دیار میں ہونے لگے مقام
تعجیل پر تھی پر نظر سرور انام
ٹھہرے نہ تین دن سے زیادہ کہیں امام
جس سرزمیں کا عزم تھا حد اس کی پاگئے
آخر قریب منزل مقصود آگئے

مطلع

(۱۳۳)

جب طوس میں ورود امام رضاؑ ہوا
ذکر نزول رحمت حق جا بجا ہوا
ہر گھر میں اک اساس مسرت بپا ہوا
سب شہر انبساط سے عشرت فزا ہوا
فیض قدوم شہ سے نیا طور ہو گیا
آتے ہی شہر طوس کا رنگ اور ہو گیا

(۱۳۴)

پھیلی ورود میمنت آلود کی خبر
چرچا ہوا کہ آئے امام ملک سیر
نکلے گھروں سے شوق زیارت میں سب بشر
آمد سے باخبر ہوا مامون بدگہر
سرگرم باطناً تھا نفاق امام میں
مصروف ظاہراً ہوا وہ اہتمام میں

(۱۳۵)

پہنچا عمائد و امرا کو یہ حکم عام
سب جائیں پیشوائی کو ہے آمد امام
واجب ہے خاندان رسالت کا احترام
منظور ہے تواضع و خاطر میں اہتمام
اس امر میں مزید توجہہ دکھائیں گے
لینے کو شہ کے ہم در دولت تک آئیں گے

(۱۳۶)

سب شہر کے رئیس روانہ ہوئے اُدھر
مصروف اہتمام ہوا یاں وہ بد سیر
بہر نثار لخت دل سید البشر
مملو کئے گہر سے طبق ہائے سیم و زر
خلعت سے مال و زر سے گرانبار ہوگئیں
یاں پیش کش کی کشتیاں تیار ہوگئیں

(۱۳۷)

ایوان خسروی میں ہوئی جشن کی بنا
دیبا و پرنیاں کا بچھا فرش جا بجا
گلدستوں میں لگائے جواہر گراں بہا
شداد کا بہشت بنی وہ محل سرا
گوشوں پہ اس کے لعل بدخشاں جڑا گیا
بہر جلوس تخت مرصع دھرا[۸۹] گیا

(۱۳۸)

پہنچی قریب آپ کے آنے کی جب خبر
شہزادے پیشوائی کو نکلے بکر و فر
حاضر ہوئے حضور شہنشاہ بحر و بر
تھامے ہوئے رکاب کو سب آئے تا بہ در
کیا جاہ و احتشام شہ دیں پناہ تھا
یاں منتظر ورود کا خود بادشاہ تھا

(۱۳۹)

کس عظمت وجلال سے داخل ہوئے جناب
اللہ رے مراتب و رعب و وقار[۹۰] و داب
حاکم ہوا جو فیض زیارت سے بہرہ یاب
خود غاشیہ بدوش چلا ہمرہ رکاب
آنکھوں پہ لے کے آئے سب اس حق کے نور کو
تخت مرصع پہ بٹھایا حضور کو

(۱۴۰)

راحت سے شہر طوس میں کچھ دن ہوئے بسر
دنیا کی زینتو[۹۱] پہ نہ تھی آپ کی نظر
خوف خدا میں روتے تھے سلطان بحر و بر
ان کے سوا کسی کو نہ تھا کچھ خدا کا ڈر
ظاہر میں جتنے لوگ تھے کم تھے غلام سے
باطن میں تھی ہر اک کو عداوت امام سے

(۱۴۱)

ظاہر ہوا کتابوں سے انجام کا بھی حال
آئے نہ آفتاب امامت پہ کیوں زوال
کہنے سے سب کے دل میں شقی کے ہوا خیال
میں شاد ہوں جو روح پیمبرؐ کو[۹۲] ہو ملال
رونے کی پھر بلند صدا جا بجا ہوئی
ٹھہرے وہ مشورے کہ قیامت بپا ہوئی

(۱۴۲)

حضرت کو پھر بلا کے یہ اس نے کیا کلام
انگور اک مقام سے آئے ہیں یا امام
کچھ نوش کیجئے کہ نہیں دیر کا مقام
فرمایا خوب صبر و رضا سے ہے مجھ کو کام
دشمن جو آپ کے تھے انہیں بھی قلق ہوئے
انگور آئے جب تو جگر سب کے شق ہوئے

(۱۴۳)

کچھ نوش کرکے کہنے لگا دلبر رسولؐ
اس کو اٹھا لے کوئی کہ مطلب ہوا حصول
اس کے اثر سے طبع مقدس ہوئی ملول
سمجھے کہ بیٹھنا بھی یہاں کا ہے اب فضول
ہم کروٹوں میں عمر کو کاٹیں تو خوب ہے
اب آفتاب کوئی گھڑی میں غروب ہے

(۱۴۴)

ظاہر ہوئے تھے سم کے رخ پاک پر اثر
جلدی سے گھر میں آئے شہنشاہ بحر و بر
اس کا بیان ہے یہ[۹۳] جو راوی ہے معتبر
پھر پھر کے ڈھونڈھتی تھی[۹۴] کسی شخص کو نظر[۹۵]
ٹکڑے دلوں کے کردیئے اس اہتمام نے
حجرے کا در بھی بند کیا خود امام نے

(۱۴۵)

آیا جو وقت اور تو دیکھا یہ ماجرا
دیوار و در سے آتی ہے فریاد کی صدا
لپٹا ہوا ہے سینہ سے اک طفل مہ لقا
تعلیم کررہے ہیں اسے علم مصطفاؐ
در بند اسی طرح سے رہا اس مقام کا
اک یہ بھی معجزہ تھا امام انام کا

(۱۴۶)

حیرت ہوئی کہ[۹۶] کون ہے؟ یہ ماجرا ہے کیا[۹۷]
آیا یہ کس طرف سے کہ در تک نہیں کھلا
کانوں میں اس کے آگئی اک بار یہ صدا
پہنچے گا ہر جگہ پہ جو ہے نور کبریا
ہر ایک پہ عیاں ہے کہ وہ جا بجا گئے
کس طرح آسماں پہ رسولؐ خدا گئے

(۱۴۷)

حضرت کا حال غیر ہے، ہے جائے درد و غم
جب زہر کھا چکے ہیں تو اب زندگی ہے سم
کہتے ہیں سب ملک بھی(۹۸) یہ کھا کھا کے اب قسم
حضرت سے مرتبہ میں ذرا یہ نہیں ہے کم
منظور ان کو غسل کا اب اہتمام ہے
یہ ہیں نویں امام تقیؑ ان کا نام ہے

(۱۴۸)

جب کر چکے وصیتیں سلطان نامدار
فرمایا یہ پسر سے کرو شکر کردگار
مرضی ہو جو خدا کی نہیں اس میں اختیار
آخر میں یہ کہا کہ یہ ہے وقت احتضار
حالت ہے مجھ کو یاد شہ مشرقینؑ کی
روؤ تو یاد کرکے مصیبت حسینؑ کی

(۱۴۹)

یہ کہہ رہے تھے بس کہ ہوا شہ کا انتقال
کس کو ہو اِن کا رنج اسی کا تو ہے ملال(۹۹)
افسوس خاندان نبوت پہ ہے زوال
ہیں عورتیں کہاں کہ جو کھولیں سروں کے بال
دم بھر کو جو ملا تھا وہ آخر جدا ہوا
تھا لاش پر پسر کا گریباں کھلا(۱۰۰) ہوا

(۱۵۰)

دشمن جو تھے نہ لاش کے تھے وہ قریب بھی
دانتوں میں انگلیاں تھے دبائے طبیب بھی
غسل وکفن انہیں تو ہوا(۱۰۱) تھا نصیب بھی
آئے تھے کربلا سے امام غریب بھی
دل پر تھے سارے داغ فلک کے دیئے ہوئے
خود تھے رسولؐ چاک گریباں کئے ہوئے

(۱۵۱)

پوشیدہ ہر طرح سے رہے دشمنوں سے راز
ایسی شہادتیں بھی ہیں مقبول بے نیاز
جب غسل دے چکے تو پڑھی آپ نے نماز
ہم بھی ہوئے شریک ملائک کو تھا یہ ناز
(۱۰۲)(پردہ دری) راز کا تھا اہتمام بھی
لاش پدر سے ہو گئے رخصت امامؑ بھی

(۱۵۲)

واقف ہوا جو حال سے مامون بد شیم
سب کے سنانے کو یہ کہا کیا ہوا ستم
جلدی ابھی نہ دفن میں ہو خود چلیں گے ہم
یہ حشر بھی قیامت کبرا سے تھا نہ کم
اشفاق و خلق شاہ کو سب یاد کرتے تھے
تھا جن کے دل میں درد وہ فریاد کرتے تھے

(۱۵۳)

مامون بدشیم کا گریبان تھا کھلا
اٹھی جو لاش ہوگیا خود بھی برہنہ پا
آئے وہاں جہاں پہ مقدر میں تھا لکھا
حضرت ہوئے جو دفن تو محشر ہوا بپا
حضرت گئے جو طوس کی بستی اجاڑ کے
دشمن بھی رو رہے تھے گریبان پھاڑ کے

(۱۵۴)

صدقے مزار شاہؑ پہ ہوتے تھے جاں نثار
رونے کا شور اٹھتا تھا رہ رہ کے بار بار
حاکم نے بھی کیا تھا گریباں تار تار
کہتا تھا اِس زمین کو زیبا ہے افتخار
گردوں پہ ہر ملک کو زیارت کا شوق ہے
یاں کی زمیں کو عرش بریں پر بھی فوق ہے

(۱۵۵)

حضرت کا تھا وطن میں بھی ہر اک کو اشتیاق
دل کو ستا رہا تھا بہت صدمہ فراق
پہلے پہل سفر کا ہوا تھا جو اتفاق
تھی آپ کی بہن پہ جدائی یہ حد کی شاق
دن کی طرح سے نیند نہ راتوں کو آتی تھی
آواز دل ڈھڑکنے کی تا دور جاتی تھی

(۱۵۶)

حضرت کو اس سفر میں ہوا تھا بہت جو طول
ہر وقت شہؑ کی یاد میں تھیں فاطمہؑ ملول
کہتی تھیں بار بار کہ ہے زندگی فضول
افسوس مجھ سے دور ہوا دلبر رسولؐ
بستر سے گر اُٹھیں تو اُٹھیں کانپ کانپ کے
راتوں کو آپ روتی تھیں منہ ڈھانپ ڈھانپ کے

(۱۵۷)

آخر کو آپ سوئے خراساں ہوئیں رواں
ملنے کے اشتیاق میں آئی لبوں پہ جاں
گر کچھ کسی مقام پہ تھمتا تھا کارواں
کہتی تھیں وقت مفت میں ہوتا ہے رائیگاں
ہر اک کے ان کے حال پہ آنسو نکلتے[۱۰۳] تھے
جتنے تھے ساتھ آپ کے کہنے پہ چلتے تھے

(۱۵۸)

پہنچیں جو آپ منزل ساوہ کے متصل
خود ہو گئیں علیل پریشاں رہا جو دل
سچ ہے کہ صدمۂ تپ دوری ہے جانگسل
صدموں سے ہوچکی تھی طبیعت بھی مضمحل
فرمایا وہ الم ہے کہ دل درد مند ہے
جانا کہیں کا تُم کے سوا ناپسند ہے

(۱۵۹)

کہنے پہ سب چلے پہ قیامت تھی آشکار
خاطر ہو خاک جمع[۱۰۴] کہ تھا دل کو انتشار
اٹھتا تھا اہتمام سواری کو خود غبار
دیتے تھے خیر خواہ یہ آواز بار بار
بہر سلام دیکھ لو خم آسمان ہے
ساری یہ سیدہ کی سواری کی شان ہے

(۱۶۰)

پہنچیں میان شہر جو طے ہو چکی وہ راہ
پایا ہر اک کو شہر میں با حالت تباہ
دیکھا کہ ہے لباس زن و مرد کا سیاہ
سمجھیں کہ مر گیا ہے کوئی یاں کا بادشاہ
فرط ملال و غم سے نہ کیوں حال غیر ہو
کہتی تھیں اے خدا مرے بھائی کی خیر ہو

(۱۶۱)

ان کے ورود کی ہوئی مشہور جب خبر
جو شہر کا رئیس تھا دوڑا برہنہ سر
تھی کون سی وہ چشم جو اشکوں سے تھی نہ تر
کیا جانئے تھا[۱۰۵] کون سا اس رنج میں اثر
جو دل تھا غم میں شاہ کے وہ داغدار تھا
سب کا غم و الم سے کلیجہ فگار تھا

(۱۶۲)

رونے میں ڈر یہ تھا کہ نہ ہوجائیں سب ہلاک
ناقے کی گرد جو تھے گریباں تھے ان کے چاک
ملتے تھے اپنے منہ پہ قدم کی اٹھا کے خاک
سمجھے تھے سب کہ ہوں گے گناہوں سے یوں تو پاک
دوزخ سے دور ہیں جو قدم سے قریب ہیں
یہ خواہر امام رضاؑ غریب ہیں

(۱۶۳)

دل کی دھڑک نے آپ سے گو[۱۰۶] کہہ دیا تھا حال
ہر ہر قدم پہ اور بھی بڑھتا گیا ملال
کیوں حال شہر یہ ہے؟ خود آکر کیا سوال
کس نے کیا ہے ہائے زمانے سے انتقال
اس وقت لوگ رونے لگے سب پکار کے
پھینکے سروں سے سب نے عمامے اتار کے

(۱۶۴)

روتے تھے عورتوں کی طرح سے عدوے دیں
جب عورتیں بھی پیٹ کے سر آگئیں قریں
فرمایا ضبط کی بھی مجھے تاب اب نہیں
لِلّٰہ جو کہ حال ہو وہ کہہ چکو کہیں
ہر اک طرف کو شہر میں کیوں غل بُکا کا ہے
سب نے کہا کہ ہائے یہ ماتم رضاؑ کا ہے

(۱۶۵)

افسوس ہے کہ ظالموں میں ہو رہی ہے[۱۰۷] عید
سر پیٹتے ہیں ہاتھوں سے جو لوگ ہیں سعید
حاکم کو کیوں نہ لوگ کہیں ثانیٔ یزید
کچھ دن ہوئے کہ آپ کے بھائی ہوئے شہید
وہ مرگئے اجاڑ ہر اک شہر ہوگیا
حضرت نے انتقال کیا قہر ہوگیا

(۱۶۶)

جب سن لیا ہر ایک سے بھائی کا اپنے نام
غش آ گیا کہ لائی قضا موت کا پیام
بے ہوش دیر تک رہیں وہ خواہر امام
اک شور تھا کہ آپ بھی کیا ہوگئیں تمام
صدمے سے ہاتھ پاؤں بھی بیکار ہوگئے
سب اپنی جان دینے پہ[۱۰۸] تیار ہوگئے

(۱۶۷)

القصہ اور[۱۰۹] غیر ہوا سیدہؑ کا حال
بے جان کے لئے نہ گیا صدمہ و ملال
سچ ہے کہ اس سفر کا کچھ اچھا نہ تھا مآل
دن سترہ کٹے تو کیا خود بھی انتقال
بیتاب روز و شب تھیں یہ شہؑ کی جدائی سے
اب اس طرح سے مل گئیں پھر اپنے بھائی سے

(۱۶۸)

قم میں مزار پاک بنایا بہ اہتمام
جاتے ہیں آج تک تو زیارت کو خاص و عام
وہ خاک اڑا رہے ہیں کہ جو خاص تھے غلام
کہتی تھیں عورتیں بھی یہ لے کر انہیں کا نام
موت آئی جس سے دل پہ اٹھائے وہ جبر بھی
دیکھی نہ ہائے آنکھ سے بھائی کی قبر بھی

(۱۶۹)

پر یاں پہ یاد آ گیا زینبؑ کا حال زار
ایسی مصیبتوں میں کیا شکر کردگار
سو جان سے تھیں اپنے برادر پہ گو نثار
لیکن گلے پہ بھائی کے دیکھی چھری کی دھار
بھائی کے قتل ہونے کی اعدا نے عید کی
رکھی گئی لبوں پہ چھڑی بھی یزید کی

(۱۷۰)

امیدؔ! حق سے مانگ دعا، ختم کر یہ حال
دل سب کے فرط رنج و الم سے ہیں پائمال
پھر[۱۱۰] ہاتھ اٹھا کے اپنے یہ خالق سے کر سوال
روضے پہ اب بلا لے تجھے فاطمہؑ کا لال
دونوں جہاں میں خوب بڑھے آبرو مری
اس کے سوا نہیں ہے کوئی آرزو مری

حواشی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

(۱) رشک (۲) پئے (۳) زر (۴) ہیں یا (۵) سراپا (۶) بے وجہ یہ غرور یہ بیجا ہے افتخار (۷) جانِ علیؑ (۸) فہم (۲) آزادیاں (۹) ضودے رہا ہے روزنِ دیوار نور کی ☆ نکلی ہے آنکھ غرفۂ جنت سے حور کی (۱۰) اقبال و احتشام کے رہنے کی ہے یہ جا (۱۱) سامنے (۱۲) کس سے (۱۳) بھی ہیں (۱۴) رضاؑ (۱۵) وہاں (۱۶) فضا (۱۷) ہزار (۱۸) زر پود (۱۹) یہ (۲۰) یہ (۲۱) لٹکتے ہیں شاخوں میں (۲۲) بتّاسیوں (۲۳) پوشی (۲۴) کے (۲۵) جاسے (۲۶) رضاؑ (۲۷) ہوں (۲۸) تیرا لم جگر میں، دلوں پہ سنان غم (۲۹) سب دور نوع عیش ہیں پر جنس غم ہے پاس (۳۰) میں (۳۱) ہوئے (۳۲) کچھ (۳۳) سرورؑ (۳۴) شور و فغاں (۳۵) سب آتے ہیں اپنے گھر (۳۶) رضائے (۳۷) کیا اختیار تھا کہ (۳۸) کٹتی (۳۹) تھیں (۴۰) ملال (۴۱) مجھے واں (۴۲) ملال (۴۳) یعنی (۴۴) کونا (۴۵) پھر کیا سلام (۴۶) لئے (۴۷) کے (۴۸) مزار (۴۹) نہیں اٹھتے مگر (۵۰) شتاب (۵۱) مضمون ہے حدیث کا، تھے بے قرار آپ (۵۲) تاب (۵۳) جادے (۵۴) تر (۵۵) طرقوا (۵۶) مخدم (۵۷) رنگ (۵۸) ہوتا تھا خون (۵۹) تھی (۶۰) حکمت صنعت (۶۱) حال (۶۲) ہو (۶۳) نہیں (۶۴) یکقلم (۶۵) ہو (۶۶) وہ (۶۷) قیام (۶۸) بیچو بۂ خیام (۶۹) چوٹی کلس کی طرح سے (۷۰) تاجدار (۷۱) لسائی (۷۲) حسن وخلق (۷۳) خلق (۷۴) ملک (۷۵) فیض (۷۶) قریب شام (۷۷) میمنت گزیں (۷۸) مسرور وشادماں ہوا حد سے زیادہ تر (۷۹) کا صلہ پا چکا بجا (۸۰) پھر (۸۱) مقدم (۸۲) بسر (۸۳) جذب دلی (۸۴) یہ (۸۵) پہ (۸۶) اپنا (۸۷) ہو (۸۸) مقام (۸۹) رکھا (۹۰) جلال (۹۱) دولتوں (۹۲) پہ (۹۳) یہ ہے (۹۴) ڈھونڈھتے تھے (۹۵) مگر (۹۶) یہ (۹۷) یہ کیا ہے ماجرا (۹۸) فلک پہ (۹۹) خیال (۱۰۰) پھٹا (۱۰۱) نہ ہوا (۱۰۲) اثنائے راہ کا تھا زبس (۱۰۳) ٹپکتے (۱۰۴) جمع خاک (۱۰۵) کیا جانے تھا یہ (۱۰۶) یوں (۱۰۷) ہو رہی ہے ظالموں میں (۱۰۸) کو (۱۰۹) سن کر یہ حال (۱۱۰) پر۔